زمین جاگ رہی ہے



زمین جاگ رہی ہے

ابراہیم جلیس

کتاب منزل لاہور

پہلا ایڈیشن ۱۹۴۵ء
دوسرا " ۱۹۴۹ء
تیسرا " ۱۹۵۶ء

طابع و ناشر: کتاب منزل

شیخ نیاز احمد پرنٹر و پبلشر نے اپنے علمی پرنٹنگ پریس سے طبع
کرا کر۔ کتاب منزل کشمیری بازار لاہور سے شائع کی۔

ترتیب

مقدمہ ۵

چدر ۱۱

رشتہ ۲۳

بلیک آؤٹ ۳۱

تنخواہ کا دن ۵۱

آنسو جو بہہ نہ سکے ۵۹

رزّاق اور عبدالرّزاق ۷۱

اشرف المخلوقات ۸۱

صراطِ مستقیم ۸۹

سگِ لیلیٰ ۱۰۳

دلدر ۱۱۱

ریلیف فنڈ ۱۲۱
زرد چہرے ۱۳۷
توند ۱۵۳
آنچل ہے کہ پرچم ۱۶۹
درانتی اور ہتھوڑا ۱۸۳
آدم خور ۱۹۷
زبیدہ اور ہم تینوں ۲۰۵

مقدّمہ

یہ مقدمہ نویسی اچھی خاصی مقدمہ بازی ہے۔ اُردو زبان میں فنِ تنقید جس قدر کمزور ہے۔ اسی قدر زیادہ قوی فنِ تعریض اور فنِ توصیف ہے۔ تنقید کا رسمی معیار تو صرف اتنا ہی ہے کہ بپاس خاطرِ احباب ان کی کتابوں کا اہلِ ذوق سے اور زیادہ تر "بازار" سے تعارف کرا دیا جائے۔ البتّہ تعریض اور توصیف کی کوئی حد مقرر نہیں۔ اور ہو بھی نہیں سکتی۔ اس لیئے کہ عام طور پر مقدّمہ نویس اور نقّاد یہ تو بہت ہی کم دیکھتے ہیں کہ کیا لکھا ہے مگر سب سے زیادہ یہ دیکھتے ہیں کہ کس نے لکھا۔ میں بہت ہی ادنےٰ درجہ کا نقّاد ہوں اسی لیے نظم و نثر میں میری نظر فن کے معائب و محاسن کی جانب بعد کو جاتی ہے، پہلے میں اپنے تاثّرات کو دیکھتا ہوں کہ میں نے جو افسانہ پڑھا یا جو نظم سُنی اس نے میرے احساسات میں کتنی لرزش پیدا کی۔ مجھے تسلیم ہے کہ میرا یہ نقطۂ نظر محض جذباتی ہے۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کسی

شعر کی "زبان" خراب ہو یا اس میں کوئی فنی سقم ہو مگر میں اس کو سنتا ہوں۔ تو سر دُھنتا ہوں۔ جب کوئی مصرعہ میرے ساز کے کسی تار سے چُھو جاتا ہے تو میں بتا ہی نہیں سکتا کہ وہ بات کیا تھی جس سے میں نے لطف حاصل کیا۔ اسی طرح افسانوں کے متعلق بھی میں اکثر نگارش و انشا۔ تخیّل و پلاٹ اور زبان اور طرزِ ادا اور ادبی نقش و نگار سے گزرتا چلا جاتا ہوں اور لکھنے والے کی اگر کسی بات نے میرے جسدِ معنوی میں کوئی چٹکی لی ہے تو بس وہ میرے لیے کافی ہے۔ میں افسانہ کی تمام خامیوں سے قطع نظر کر کے کہہ دیتا ہوں کہ خوب لکھا۔ بہت اچھا لکھا۔

جو شخص ادب کی فنی حیثیت کے متعلق اس قدر بے لگام اور بدلگام بھی ہو، اس سے مقدمہ نویسی کی فرمائش اور پھر ادیبانہ اور عالمانہ نقد و نظر کی توقع محض زبردستی ہوگی۔ جلیس سے میں اتنا ہی واقف ہوں کہ ان کے بعض افسانے مجھے بہت پسند آئے۔

اور میں نے اُن کو "پیام" میں شائع کیا۔ میں نے ان کے افسانوں میں ایک نوجوان جذبہ دیکھا جو جلیس کی جوانی کو ہندوستان کی سماجی زندگی کی تاریک گلیوں میں لے جا رہا ہے۔ ان گلیوں میں جہاں بھوک، افلاس، مفلسی، اخلاقی اور مالی قنوطیت کے گندہ چیتھڑوں میں اس مُلک کی انسانیت لپٹی پڑی ہے ــــــ کسی نالی میں، کسی بدرو میں، کسی چہ بچّہ میں ــــــ ہماری سماج کے اس میلے اور بوسیدہ کفن کے دھبّے نوجوان افسانہ نگار کو جہاں بھی نظر آئے وہ وہیں بے چین ہو گیا۔ سماج کے ان جھونپڑوں میں اس نے کہیں جنسی جذبات کی گھناؤنی تصویریں دیکھیں۔ کہیں غریبوں کی غیرت کی کوئی چنگاری چمکتے دیکھی۔ کہیں تعلیم یافتہ بے روزگاروں اور کہیں جاہل مزدوروں کے دلوں کے پردوں میں جھانکا اور جس نتیجہ کوئی اثر پیدا

ہُوا۔ اُسی لمحہ اپنے قلم کی قوّت اس اثر کے حوالے کر دی۔ یہ میرے نوجوان دوست جلیس کی افسانہ نگاری ہے۔ وہ خود ایک تعلیم یافتہ نوجوان ہیں۔ اس لیے اس میٹھے زہر کو جس کا نام جدید تعلیم ہے۔ جی بھر کے پی چکے ہیں۔ ایک مقام پر لکھتے ہیں:

"۔۔ کچھ دنوں بعد میں نے سُنا کہ اس مال روڈ کی حسینہ کی شادی اسی کلرک دوست سے ہو گئی جو کالج کی زندگی سے میرا دوست تھا۔ ایک دُبلا پتلا مریل سا انسان۔ عملی زندگی میں قدم رکھنے سے پہلے ہی کتابوں نے اُسے چاٹ لیا تھا۔ یہ لارڈ میکالے کا احسان عظیم ہے کہ جس طرح دیمک کتابوں کو چاٹ جاتی ہے۔ اسی طرح کتابیں ہندوستانیوں کو چاٹ رہی ہیں۔۔"

اپنے ایک دوسرے افسانے میں ایک جاں بلب بھکشو کے بھکاری کی زندگی کے آخری لمحوں کو (جس کی زندگی ہمارے سماج کی مکروہ اور ہیبت ناک رُوح ہے) اس طرح پیش کرتے ہیں۔

"۔۔۔ وہ دوڑی دوڑی بالکونی میں آئی۔ بارش تھم چکی تھی۔ سامنے والے برگد کے پیڑ تلے ایک بوڑھا بھکاری سر سے پاؤں تک بھیگا ہُوا، اس کی گردن ایک جانب ڈھلکی ہوئی مگر آنکھیں بالکونی پر لگی ہوئی تھیں۔ بیوہ ٹھکرائن نے چاندی کے دو چمکدار سکّے اس کی طرف پھینکے۔ سکّوں کے چھناکے سے بوڑھا چونک اُٹھا۔ ——— سامنے کیچڑ میں دو سکّے پڑے جگمگا رہے تھے۔ بوڑھا بھکاری ناتواں آواز میں بڑبڑایا۔

"ہو گیا ـــــــ میرا دلدّر دُور ہو گیا۔"

وہ آہستہ سے اُٹھا مگر یکبارگی کیچڑ میں مُنہ کے بل گرا۔ اس کا لرزتا ہوا ہاتھ سکّوں کی طرف بڑھا اور لرز کر رُک گیا۔ اس نے آنکھیں پھاڑ کر ان سکوں کو دیکھا ـــــــ مُسکرایا پھر دفعتاً ایک جھٹکے کے ساتھ اس کا سر دھرتی سے لگ گیا۔ بھکاری اور بھیک کے درمیان موت حائل ہو چکی تھی۔ اس کا سب دلدّر دُور ہو چکا تھا۔ مگر اس کی کھُلی ہوئی بے نور آنکھوں سے زندگی کا لالچ اب بھی جھانک رہا تھا ـــــــ"

یہ کتاب غالباً حقیقت نگاری کی پہلی کوشش ہے جو جلیس نے کی ہے۔ جو موضوع اُنھوں نے اختیار کیا ہے ـــــــ سماج کے پست طبقات کی نفسیات ـــــــ وہ ایک بہت وسیع موضوع ہے۔ رات کی اس تاریکی میں جلیس رات بھر چلتے رہیں گے اور صبح کو دیکھیں گے کہ جہاں سے پہلے چلے تھے وہیں ہیں مگر سماج کے اس قبرستان کی نئی اور پُرانی ہڈیوں اور انسانیت کے میلے کفن اور ٹوٹی ہوئی قبروں میں بصیرت کے بے بہا خزانے دفن ہیں۔ زمانے نے ان کے قلم میں طاقت دی ہے۔ وہ سوچتے بھی ہیں۔ متاثر بھی ہوتے ہیں۔ اس لیے جو راستہ اُنھوں نے اختیار کیا ہے وہی ان کے لیے صحیح راستہ ہے ـــــــ جو کچھ خدمت بن آئے کرتے رہیں ـــــــ کوشش خود اپنا انعام ہے۔ اس سے زیادہ میری مقدمہ نگاری کے پاس ان کے لیے کیا ہے ـــــــ؟

آخر میں ایک بات ان سے بھی اور تمام نوجوان اہلِ قلم سے کہتا ہوں۔ وہ یہ کہ اپنے قدرتی رُجحانات کے تحت جو موضوع اختیار کریں اُسی پر جمے رہیں۔

انھی کے تصوّرات کو ارتقا کی منزلیں طے کرائیں۔ ایک سے زیادہ موضوعات پر لکھنے کی کوشش نہ کریں۔ ایسا کریں گے تو ذہنی انتشار میں مبتلا ہو جائیں گے میں "ادب برائے ادب" کی لذّتوں سے بے خبر نہیں۔ مگر ادب کی اس قوّت کو جو کسی مقصد کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ ایک عظیم ترین قوّت سمجھتا ہوں۔ وہ تیغ اصفہانی جو کسی عجائب خانے کی دیوار پر لٹکی ہوئی ہو ضرور ایک نظر افروز جوہر رکھتی ہے۔ لیکن وہ اس ٹوٹی ہوئی تلوار سے بھی بہت کم قابلِ قدر ہے جو کسی سپاہی کی کمر سے بندھی ہے۔

جلیس نے جس میدان میں قدم رکھا ہے وہ بہت سے ایسے نوجوانوں کا منتظر ہے جن کی جوانی دیوانی ہو۔ میں ان نوجوانوں کی تحریروں میں ادبی سقم اور زبان کے عیوب تلاش نہیں کیا کرتا ——— لفظوں کی چادر کے نیچے جو زخم پوشیدہ ہیں۔ اُن کو دیکھتا ہوں اور ہمیشہ دُعا کرتا ہوں کہ اس بد نصیب مُلک کی خاطر ہمارے نوجوان اہلِ قلم ——— زندگی کے عبرت آموز حقائق کے یہ ترجمان ——— شعر و ادب کے اس میدان میں بڑھتے چلے جائیں ——— بے محابا ——— ! مجھے ان کے الفاظ سے زیادہ ان کا احساس اور ان کے الفاظ کی رُوح عزیز ہے۔

فریاد کی کوئی لَے نہیں ہے
نالہ پابندِ "نَے" نہیں ہے

قاضی عبدالغفّار

چور

"رانی ——— تم سچ مچ کی رانی ہو۔"

مارواڑی لڑکے نے رانی پر منڈلاتے ہوئے کہا ——— رانی سچ مچ کی رانی نہیں تھی بلکہ مارواڑی لڑکا نشے میں دھت ہو رہا تھا۔ وہ تو ایک کنگال کنواری تھی جس کو رانی کا نام دے کر اُس کے ماں باپ نے اپنے دیس کی روایتی محبّت کا ثبوت دیا تھا۔ بڑی پیاری صورت تھی اس کی، مگر بھوک کے مارے اس کے گلنار رخسار پیلے پڑ گئے تھے۔ اس کے برف ایسے سپید ہاتھوں پر نیلی نیلی رگیں اُبھر آئی تھیں۔ اور مارواڑی لڑکا اپنی سونے اور ہیرے کی انگوٹھیوں میں جگمگاتی انگلیوں سے اس کے دونوں ہاتھ پکڑے ایسی بے ساختگی سے مسکرا رہا تھا جیسے رانی گدگدی بن کر اس کے جسم میں سرایت کر گئی ہے۔ اگرچہ وہ محسوس کر رہا تھا کہ رانی کے بے رس ہونٹوں اور پیلے پیلے رخساروں میں بھوک نے کڑوی نمکولیوں اور کچے

سیبوں کی سی نمی اور گھٹا سی پیدا کر رکھی ہے۔ مگر اس کے وید نے اس کے لیے چالیس کنواریوں کی شرط لگا رکھی تھی ——— اور رانی کا نمبر چالیسواں تھا۔ مارواڑی لڑکے کی خوشی کی انتہا نہ تھی ——— وہ بار بار بنگال کے قحط اور اس کے لانے والوں کو دعائیں دے رہا تھا۔

نڈھال اور نیم جان رانی اونچے محل کی بے شمار سیڑھیاں طے کر کے نیچے آئی تو اسے یوں محسوس ہونے لگا۔ جیسے وہ آسمان سے دھرتی پر اتر آئی ہے۔ آسمان سے دھرتی۔ دھرتی سے آسمان ——— زندگی کی یہی تو منزلیں ہیں۔ ازل سے لے کر ابد تک! ——— انسان مکان و زمان کی قید سے کبھی آزاد بھی ہو گا؟ رانی کو دیکھ کر بوڑھے ماں باپ اور گیارہ ننھے ننھے بھائی بہنوں نے اسے گھیر لیا۔ باپ نے اپنا لرزتا ہوا جھریوں پڑا ہاتھ اس کے سر پر پھیرتے ہوئے اشیرواد دی۔۔۔ آشیرواد! ماں نے اپنے میلے آنچل سے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے اس کی بلائیں لیں۔۔۔ بلائیں۔

اشیرواد اور بلائیں ——— آج سے پہلے جب کبھی اس کے ماں باپ اس کو اشیرواد دیتے اور بلائیں لیتے تو اس کے دل میں مور سا ناچنے لگتا تھا ——— سچ اس کے من کا مور مر گیا تھا۔ وہ یوں گم سم ہو گئی تھی۔ جیسے مارواڑی لڑکا کوئی زہریلا ناگ تھا۔ جو اسے سونگھ کر چلا گیا۔

ایک کان میں اس کا باپ کہہ رہا تھا ——— میری بچی تو بوڑھے والدین کی بڑی لڑکی ہے ——— دوسرے کان میں اس کی ماں کہہ رہی تھی ——— میری لاڈلی تو ان گیارہ ننھے ننھے بچوں کی بڑی بہن ہے۔ رانی سوچ رہی تھی کہ وہ بڑی لڑکی

اور بڑی بہن کے علاوہ کچھ اور بھی ہے ——— اس کی آنکھیں خلا میں اپنے منگیتر چندر کو ڈھونڈھ رہی تھیں جو کلکتہ یونیورسٹی کا ایک بیروزگار گریجویٹ تھا اور ایک عرصے سے نوکری کی تلاش میں کلکتے گیا ہُوا تھا۔ ہر ہفتے وہ رانی کے نام کلکتے سے ایک محبّت بھری چٹھی بھیجا کرتا تھا۔ ابھی کل ہی تو اس کی چٹھی آئی تھی کہ وہ بہت جلد رانی سے ملنے آنے والا ہے۔ شاید اگلے بُدھ تک ——— رانی دل ہی دل میں کالی ماتا سے پرارتھنا کرنے لگی کہ اگلے بُدھ تک وہ کسی طرح دھرتی سے اُٹھ جائے ——— اگلا بُدھ طلوع ہی نہ ہو پاتا!

بوڑھے باپ نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا "چل بیٹی ——— اب چلیں"۔

رانی کا جی چاہا کہ اپنے باپ کا ہاتھ بڑی ذلّت سے جھٹک دے مگر نقاہت سے وہ نیلی رگوں کے جال میں پھنسی ہوئی تھی۔ اس لیے چُپ چاپ اپنی ساڑھی کے پلّو میں سے ہاتھ بڑھا کر چاندی کے پانچ سکّے اپنے باپ کی ہتھیلی میں تھما دیے .... اب پُورا قافلہ چلنے لگا۔ اس قافلے کی رُکی ہوئی زندگیاں چلنے لگیں۔ کیا تاثیر ہوتی ہے چاندی کے سکّوں میں!

ابھی یہ قافلہ ایک بجلی کے کھمبے سے دوسرے کھمبے تک بھی نہ گیا ہوگا کہ ایک جانی پہچانی آواز سے وہ رُک گیا۔ اس آواز سے رانی کے کانوں کے پردے تھرتھرانے لگے۔ اس کا جسم چوٹی سے ایڑی تک کانپنے لگا۔ اس نے پلٹ کر گھبرائی ہوئی نظروں سے چندر کو دیکھا جو ایک میلا پھٹا کوٹ اور ڈھیلا ڈھالا پاجامہ پہنے بغل میں ایک چھوٹا سا بستر دبائے دَوڑا دَوڑا چلا آرہا تھا ———

آج بُدھ تو نہیں تھا!

"ارے چاچا! —— یہ پلٹن کہاں لیے جا رہے ہو؟ چاچا کچھ سُنا تم نے مجھے نوکری مل گئی ہے تیس روپے ماہانہ۔ اب تم کو محنت مزدوری کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ چاچا میں کماؤں گا تمہیں موسی کو، رانی کو اور ان ننھے ننھے خرگوشوں کو پالا کروں گا۔ چلو گھر چلو۔ دیکھو میں کیا کیا چیزیں لایا ہوں کلکتے سے —"

چاچا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ البتہ بڑھیا نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر قحط اور گرانی کو کوسنا شروع کیا۔ "بیٹا —— کون سے گھر چلیں۔ مکان والے نے گھر سے بے دخل کر دیا ہے۔"

"تین مہینے سے کرایہ نہیں دے سکے تھے نا۔ اب تو یہ بجلی کے کھمبے ہی —!"

چندر کے لال انگارہ گالوں کو بڑھیا کے جملوں نے پانی کے چھینٹوں کی طرح بجھا دیا —— مگر فوراً ہی اس نے رانی کی موجودگی کا احساس کرتے ہوئے فخریہ انداز میں کہا "ارے تو کیا پڑا ہے موسی —— جب تک چندر کے جسم میں لہو کی ایک بوند بھی باقی ہے۔ چندر اپنی موسی کے لیے (یعنی اپنی موسی کی لڑکی کے لیے) زمیندار کے دو منزلہ مکان سے اونچی عمارت کھڑی کر سکتا ہے —— ہاں! اچھا تو موسی اسی بجلی کے کھمبے کے پاس ڈیرہ لگا دو۔ پھر —— مجھے تو بڑوں زوروں کی بھوک لگی ہے۔"

چندر نے اپنا بستر فٹ پاتھ پر رکھ کر کھولا اور اس میں سے ٹین کے دو تین ڈبے نکال کر سب کے سامنے رکھ دیے۔ دیسی اور انگریزی مٹھائیوں کی ملی جلی سوندھی خوشبو سے ننھے ننھے خرگوشوں کے نتھنے پھڑکنے لگے۔ اور وہ چیلوں کی طرح ان پر جھپٹ پڑے —— مگر رانی گم سم ہی بیٹھی رہی۔ ماں کے اصرار پر

اس نے دو ایک لقمے پانی کے گھونٹ کے ساتھ حلق سے اُتارے۔ چندر سوچ رہا تھا کہ یہ بھی ایک ادا ہوتی ہے لڑکیوں کی۔ وہ بار بار دزدیدہ نظروں سے رانی کی جھکی ہوئی پلکوں اور گھنے گھنے ابروؤں کو دیکھ کر اپنے پر شعریت اور رومانیت کا عالم طاری کر رہا تھا۔ کھانے سے زیادہ وہ یہ سوچ رہا تھا۔ کہ جب تک لڑکیاں شرماتی ہیں۔ بڑی سُندر معلوم ہوتی ہیں۔ ذرا شرم دُور ہوئی کہ سارا مزہ کرکرا ہوگیا۔ ادھر رانی کے جسم پر بار بار رونگٹے کھڑے ہو رہے تھے۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے اس کے من کا مور ابھی مرا نہیں بلکہ زخموں سے چُور ہو کر پھڑ پھڑا رہا ہے — دھڑک دھڑک — دھڑک دھڑک ...

کھانے سے فارغ ہو کر چندر ایک سستی سی سگریٹ جلا کر ایک گونہ سکون اور سرور کے زیر اثر رانی سے کچھ باتیں کرنا اس کو چھیڑنا اور ہنسانا چاہتا تھا۔ اس کو رانی کی ہنسی بہت پسند تھی۔ وہ جب ہنستی تھی تو ... چندر کوئی بالکل انوکھی تشبیہ سوچ رہا تھا کہ ایک پولیس والے نے اپنی مونچھوں کو بھونڈا سا بل دیتے ہوئے اُنہیں ڈانٹا "ارے کیا یہ تمہارے باپ کی سڑک ہے۔ چلو اٹھو یہاں سے اُٹھائی گیر کہیں کے۔"

چندر کو پولیس والے کی یہ مداخلت بڑی ناگوار معلوم ہوئی۔ خصوصاً اُس وقت جب وہ رانی کے ساتھ ایک خیالی اُڑن کھٹولے میں بیٹھا اپنی یوٹوپیا کی سیر کر رہا تھا اور اس کی ہنسی کے متعلق کوئی رنگین تشبیہ اس کے ذہن میں نہیں آئی تھی۔ مگر اس نے سپاہی کی مونچھوں کا بل دیکھ کر جھگڑا بڑھانا مناسب نہ سمجھا۔ یہ ایک حقیقت تھی کہ غریبوں کے باپ بھی غریب ہوتے ہیں۔ اسی لیے ایسی

صاف شفاف سڑک ان کے باپ کی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ ممکن ہے کہ ان کے باپ دادوں نے یہ سڑک بنائی ہو۔ مگر اس سے کیا ہوتا ہے ... تاج محل جانے کن معماروں نے بنایا تھا، مگر دُنیا یہی کہتی چلی آئی ہے کہ شاہجہان نے بنایا ہے تاج محل۔

"ابے او بُڈھے —— سنتا ہے کہ نہیں —— لے چلو تھانے ——؟"

بُوڑھا اُٹھ کر سپاہی کی خوشامد کرنے لگا۔ "سرکار —— آج ایک رات بسر کر لینے دو۔ کل سویرے ہی چلے جائیں گے۔ قحط کے مارے ہیں۔ سرکار تو مائی باپ ہے۔ دیا کرو ہم پر ——"

چندر کو بُوڑھے کی اس رجعت پسندانہ ذہنیت پر بڑا غصّہ آیا۔ اُس نے سوچا کہ اگر سرکار مائی باپ ہے تو بیشک یہ سڑک بھی ہمارے باپ کی ہے مگر دُنیا ابھی تک رجعت پسندی اور مُونچھوں کے بل میں پھنسی ہوئی ہے۔ پھر کیا فائدہ ایسی تاویلات سے۔ اُس نے جیب سے ایک چونی نکال کر رانی کو دکھاتے ہوئے سپاہی کے ہاتھ میں رکھ دی۔ دراصل چندر رانی کو مرعوب کرنا چاہتا تھا کہ رانی کا راجہ کلکتے سے سچ مچ کا راجہ بن کر لوٹا ہے۔

سپاہی مُسکراتا ہُوا آگے نکل گیا۔ اور بوڑھا بُڑبُڑانے لگا۔

"اِتنی بڑی دھرتی —— اور ہمارے باپ نے ہمارے لیے چپّہ بھر زمین بھی نہیں چھوڑی" اور بُوڑھے نے اپنے پُرکھوں کو ایک شرمناک گالی دی۔

چندر نے بُوڑھے کو سمجھاتے ہوئے کہا "چاچا —— کچھ غم نہ کرو۔ ظلم کی چکّی سدا نہیں چل سکتی۔ ایک نہ ایک دن تو اُسے رُکنا ہی پڑے گا۔ اب تو اپنے دیس میں اشتراکیت ... ..."

معاً چندر چونک پڑا کہ وہ جانوروں کے آگے بین بجا رہا ہے۔ یہ بُوڑھے کیا جانیں دیس کیا ہوتا ہے اور اشتراکیت کسے کہتے ہیں۔ ان کی تو جتنی کھوپڑی ہے اتنا ہی دماغ ہے۔ اس وقت اس نے رانی کی طرف دیکھتے ہوئے آنکھوں ہی آنکھوں میں کہا "رانی —— بھگوان نے چاہا تو ہماری اولاد کچھ کر دکھائے گی۔

چندر آنے والی نسل کے بارے میں پکّا رجائی تھا۔ اسی لیے ابھی سے بے فکر ہونے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے بُوڑھے سے کہا "چاچا —— کوئی فکر کی بات نہیں۔ اندھیری رات کے بعد صبح ضرور ہوگی میرے پاس اس وقت سترہ اٹھارہ روپے ہیں۔ کل سویرے ہی کلکتہ چلیں گے۔"

اور پھر اس نے شرما کر سر جھکاتے ہوئے کہا "اور وہاں —— وہاں"

بوڑھا چندر کا مطلب سمجھ گیا۔ اور ایک ٹھنڈی سانس میں جواب دیا۔

"بیٹا —— بھگوان تمہیں سکھی رکھے —— !"

دوسرے دن بھوکوں کا یہ قافلہ کلکتے پہنچا۔ چندر نے اڑوس پڑوس کے لوگوں اور شناساؤں کو بتایا کہ وہ اپنی رانی کو کلکتے لے آیا ہے۔ اپنے خاص خاص دوستوں کو ایک گھٹیا سے ہوٹل میں ایک چھوٹی سی پارٹی بھی دی۔

کلکتے پہنچ جانے کے بعد بُوڑھے بُڑھیا اور ننھے خرگوشوں کے پیٹ میں بھوک شعلوں کی پہلی سی غضبناکی نہ رہی تھی۔ البتّہ رانی اسی طرح گم سم تھی جیسے مار دار ناگ کا زہر ابھی تک اس کے جسم میں اس کی رُوح میں رچا ہُوا ہے۔ چندر کو بعض اوقات حیرت ہوتی اور وہ اس پتّھر کی مورتی کو دیکھ دیکھ کر بقول خود "فیڈ اپ" ہو جاتا تھا۔ مگر انسان اپنے آپ کو بہلا بھی تو لیتا ہے۔ "ارے یوں

ہی ہوتا آیا ہے"۔ ہر ہندوستانی لڑکی اپنے دولھا کو دیکھ کر مُنہ میں گھنگھنیاں ڈال لیتی ہے۔ خیر شادی ہو لینے دو۔ پھر دیکھنا رانی صاحبہ کی ننھی سی جیب میرٹھ کی قینچی تک کو مات نہ کر دے تو میرا نام چندر نہیں۔

ایک دن بر سبیلِ تذکرہ اپنے ایک بڑے عزیز دوست سے رانی کے متعلق کہہ ہی دیا کہ وہ لڑکی نہیں۔ ممی ہے ممی ———!

اس دوست نے اپنا تجربہ بتاتے ہوئے اس کا شک دُور کیا کہ بھئی ——— شادی سے پہلے ہر ہندوستانی لڑکی ممی ہی ہوتی ہے۔ اب ہماری شریمتی کو ہی دیکھو۔ شادی کے بعد پُورے آٹھ دن تک ہزار آفتوں اور لاکھ خوشامدوں کے باوجود ایک حرف بھی زبان سے نہیں نکالا تھا۔ اور اب یہ حالت ہے کہ "آٹو چینج اور آٹو ریلیز گراموفون" کی طرح دن بھر چلتی رہتی ہے "کہاں رہتے ہو ——— گھر کی بھی کوئی فکر ہے تمہیں ——— پیسے نہیں رہے چاول ختم ہو گئے ——— موئے جاپانیوں کو کالی ناٹا نگل لے ——— جب سے برما پر قبضہ کیا ہے ..." اور یہاں سے وہ ساری بین الاقوامی سیاست پر لیکچر دینے لگتی ہے۔ بھلا سوچو تو۔ کہاں عورت کی زبان کی شیر بنی اور کہاں اٹلانٹک چارٹر کی کڑوی دفعات۔ بڑی پرل بگ بنی پھرتی ہے ——— ارے عورت کی زبان کو تو نام منہ نیم کی پتی ہونا چاہیے ——— ذرا چھوا نہیں اور دُودھ کے ریگ زار میں مدھ کا سیلاب بہا نہیں۔ بعض اوقات میں تو بالکل تنگ آجاتا ہوں۔ تم بھگوان کا شکریہ ادا کرو کہ تمہیں میری طرح تعلیم یافتہ بیوی نہیں ملی"۔

چندر مُسکرا دیا اس کو تعلیم یافتہ عورتوں سے چڑ تھی۔

عورتوں کی اس جماعت کے بارے میں وہ خالص رجعت پسند اور خود غرض تھا۔ تھرڈ کلاس گریجویٹ تھا۔ اسی لیے تعلیم یافتہ عورت سے شادی کر کے اپنے آپ کو احساس کمتری میں مبتلا کرنا اسے کسی قیمت پر بھی گوارا نہیں تھا۔ اُس نے بی'اے صرف اس لیے کیا تھا کہ بی'اے کی ڈگری قابلیت کی سند سے زیادہ دُنیا کے بازار کی ایک جنس ہے۔ موجودہ تعلیم کے متعلق وہ کہا کرتا تھا کہ ہم ۷۵ فی صدی علم کے بجائے ۷۵ فی صدی حاضری کے لیے کالج جایا کرتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھتا تھا کہ اس کی رانی تعلیم یافتہ عورت کی طرح دردِ سر نہیں بلکہ دردِ جگر ہے۔

چندر کو اب رانی کی بھری ہوئی جوانی پر کوئی حیرت نہیں ہوتی تھی۔ البتہ بعض اوقات وہ "فیڈ اپ" ضرور ہو جاتا تھا کہ عجیب لڑکی ہے۔ کبھی چوری چھپے ایک ہلکی سی مسکراہٹ سے بھی نہیں بہلاتی ——— اور یہ بڑھیا تو آٹھوں پہر رانی سے چڑیل کی طرح چمٹی رہتی ہے۔ کبھی رانی کو تنہا نہیں چھوڑتی۔ کبھی کبھی وہ سوچنے لگتا کہ کہیں رانی کو اس کی نوکری کا راز تو معلوم نہیں ہو گیا!

چندر کی نوکری ایک راز ہی تو تھی۔ دن بھر پاؤں پھیلائے کھاٹ پر پڑا خرّاٹے لیتا رہتا۔ اور سرِ شام ہی کھانا کھا کر اپنا اکلوتا کوٹ کندھے پر ڈال کر ڈکاریں لیتا باہر چلا جاتا۔ اور رات کے تین چار بجے سے پہلے گھر نہ لوٹتا۔ چندر اپنی نوکری کے متعلق کسی کو بتاتا بھی تو کیسے ———؟ بتانے والی بات ہوتی تو بتا بھی دیتا سیٹھ ... نے بنگال کے قحط سے فائدہ اُٹھا کر خفیہ طور پر بھوکی عورتوں کی تجارت شروع کر دی تھی۔ وہ اس تجارت میں سیٹھ صاحب کا بہ حیثیت ایک کمیشن ایجنٹ

معاون تھا۔ اس نے اب تک کوئی ساڑھے تین سو کنواری، بیاہی، ادھیڑ، کالی، گوری، موٹی، دُبلی، خوبصورت، بدصورت —— عورتوں کو سیٹھ کے ہاتھ معقول کمیشن پر بیچا تھا —— کیا رانی کو یہ بات معلوم ہوگئی تھی؟ رانی کے دل کی طرح چندر کے دل میں بھی چور تھا۔

ایک رات چندر اپنی نوکری پر جانے کے لیے تیار ہی ہو رہا تھا کہ رانی کو قے ہوئی۔ اور پھر تھوڑی ہی دیر میں اس نے دو تین بار استفراغ کیا۔ چندر گھبرا گیا۔ بوڑھے بڑھیا کے منع کرنے کے باوجود وہ دَوڑا دوڑا ایک سینٹے سے ڈاکٹر کو بلا لایا۔ ڈاکٹر نے رانی کا معائنہ کیا۔ اور مُسکرایا چندر کی پیٹھ کو تھپکتے ہوئے کہنے لگا۔

"بابو —— پریشان کیوں ہوتے ہو۔ تمہیں خوش ہونا چاہیے۔"

خوش ہونا چاہیے —— چندر حیرت سے ڈاکٹر کو دیکھنے لگا۔ جیسے وہ سچ مُچ ڈاکٹر ہے یا صرف ڈاکٹر کی وردی ۔۔۔۔ ڈاکٹر نے جھک کر اس کے کان میں کہا۔

"تمہاری وائف —— ایک بچّہ کی ——"

چندر کو یوں محسوس ہُوا جیسے دھرتی ایک زبردست زلزلے سے لرز اُٹھی ہے۔ اور وہ تمام ناجائز بچّے جن کی ماؤں کو چندر نے معقول کمیشن پر سیٹھ کے ہاتھ فروخت کیا تھا چیختی ہوئی چٹانوں کے ریزے چُن چُن کر بے تحاشہ قہقہے لگاتے ہوئے چندر پر پھینک رہے ہیں۔ یہ بچّے —— یہ آنے والی نسل —— جس کے بارے میں چندر یکّا رجائی تھا۔

چندر نے لڑکھڑا کر قریب کے ستون کا سہارا لیا —— اور جب وہ آہستہ آہستہ آدمی کی جُون میں آنے لگا تو رانی کو دیکھ کر اُس کے ہونٹوں پر یکایک مُسکراہٹ

آگئی ـــــ آخر وہ اور کیا کرتا! اس کے پاس آنسو کی ایک بوند بھی نہیں تھی۔ بڑی کوشش کے بعد اس نے اپنے گلے کے پھندے کو کھولتے ہوئے کہا "اچھا ــ تو رانی ـــ ایک بچے کی ــــ "

اور وہ اپنے اکلوتے کوٹ کو کندھے پر ڈال کر آہستہ آہستہ باہر نکلا۔ اور پھیلتے ہوئے گہرے اندھیرے میں ڈوب گیا ــــ غائب ہوگیا ... فنا ہوگیا۔

باہر نکلتے وقت اس نے رانی کی ایک ڈراؤنی چیخ بھی سنی۔ مگر اب وہ رانی سے اتنی دور جانا چاہتا تھا کہ وہ ہلکا لطیف تار جس نے چندر کے دل کو رانی کے دل سے باندھ رکھا تھا کھنچتے کھنچتے بالآخر ٹوٹ جائے ــــ ایسا ٹوٹے کہ پھر کبھی نہ جڑ سکے ــــ مگر وہ اس تار کو جتنا کھینچتا تھا وہ اتنا ہی کھنچتا چلا جا رہا تھا۔ اگر چندر دھرتی کے آخری کنارے کو بھی پھلانگ جاتا تو جب بھی وہ نہیں ٹوٹ سکتا تھا۔

چند مہینے گزر گئے نہ چندر کہیں دکھائی دیا اور نہ رانی کا حال معلوم ہو سکا۔ بنگال کا قحط اسی طرح زوروں پر رہا۔ ہزاروں رانیوں کے بچے پیدا ہوتے رہے اور ہزاروں چندر اندھیرے میں ڈوبتے گئے ــــ غائب ہوتے گئے۔ فنا ہوتے گئے۔

ایک دن ذکریا اسٹریٹ میں سڑکوں پر پڑی ہوئی لاشوں کو اٹھانے والی بیل گاڑی چرخ چوں .. چرخ چوں کرتی آرہی تھی اور فٹ پاتھ پر ایک ڈھیا بھکاری بھوکی عورت سکرات کے عالم میں پڑی کراہ رہی تھی۔ اس کی سوکھی چھاتی کو ایک ننھا بچہ چوستے چوستے ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگیا تھا۔ گاڑیبان

جب بچے کی لاش کو اُٹھانے کے لیے جُھکا تو یکایک اس کا جسم برف کی طرح ٹھنڈا ہو گیا۔ اس بچے کی ماں فٹ پاتھ پر پڑی ڈراونی آواز میں کراہ رہی تھی ---

"چندر --- آن --- ہا --- چن --- در --- آہاں۔"

گاڑیبان نے جُھک کر اس ہڈیوں کے ڈھیر کی طرف دیکھا --- اور چندر کی نظریں عورت کی آنکھوں کے دھنسے ہوئے گڑھوں میں ڈوبتی گئیں۔ ڈوبتی گئیں۔ اور وہ بے اختیار ہو کر گھٹنوں کے بل اس پر گر پڑا۔ اس کے گالوں کی اُبھری ہوئی ہڈی کے نیچے دھنسے ہوئے گڑھے میں اپنی تھوتھنی گاڑتے ہوئے وہ گڑگڑانے لگا "میری رانی --- میری دُلہن --- میری جان!"

اور بیل گاڑیبان کی آواز سُن کر ذکریا اسٹریٹ کو بھیانک چیخوں سے گونجاتے ہوئے انسانی کیڑوں کے ایک اور ڈھیر کی طرف رینگنے لگے!

رشتہ

گرمی کی ایک لمبی سُنسان دوپہر تھی ۔ فیضو اپنے مکان کے آگے سڑک کی دُوسری جانب ریلوے کمپاؤنڈ کے سائے میں چارپائی پر ٹانگیں پھیلائے سُستا رہا تھا۔ سامنے برآمدے میں اس کی بیوی چرخہ کات رہی تھی ۔ وہ خیالات کی گہرائیوں میں گم تھا۔ نیلے آسمان کی گہرائیوں میں اُڑتی ہوئی چیل کی طرح گم۔ وہ اپنی زندگی پر غور کر رہا تھا۔ غریب کی زندگی۔ پیٹ خالی ہونے پر دماغ بہت بھر جاتا ہے طرح طرح کے خیالات سے ۔ قریب ہی قصاب کی دُکان کے آگے ایک نوکر کسی بڑے آدمی کے خوبصورت کُتّے کو تازہ کچّا گوشت کھلا رہا تھا اور نزدیک ہی ایک بیمار بھُوکا کُتّا للچائی ہوئی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ بڑے آدمی کا خوبصورت کُتّا۔ بیمار بھُوکا کُتّا۔ تازہ کچّا گوشت ۔ بڑے آدمی ۔ بھُوکے غریب ۔ زندگی ۔ بڑا اُونچا فلسفہ تھا ۔ فیضو کے دماغ میں کسی طرح نہ آتا تھا ؛

اچانک وہ چونک پڑا۔ کوئی اُسے پکار رہا تھا۔
"فیضو بھیّا۔ ارے، و فیضو بھیّا۔"
فیضو نے چارپائی سے اُٹھ کر دیکھا۔ ایک دیہاتی کندھے پر کپڑوں کا گٹھر اور ہاتھ میں ایک موٹا سا لٹھ تھامے لمبے لمبے ڈگ بھرتا فیضو کی طرف آرہا تھا۔
"ارے کون رحمو!" فیضو کے چہرے سے خوشی ٹپکی پڑ رہی تھی۔
"بستی سے آرہا ہے بھیّا۔ راضی خوشی تو ہے اور سب تو اچھے ہیں، بیٹھ جا بھیّا۔ یہاں بیٹھ۔"
ایک نامعلوم مسرّت آگئیں جذبہ میں جو کسی اپنے کو دیکھنے پر پیدا ہوتا ہے۔ اُس نے ایک ہی سانس میں سب سوالات کر ڈالے۔
رحمو نے کپڑوں کی گٹھری چارپائی پر رکھ دی۔ لٹھ کمپاؤنڈ کے سہارے کھڑا کر دیا۔ سامنے برآمدے میں فیضو کی بیوی چرخہ کاتنے میں مشغول تھی۔ رحمو نے دیکھا کچھ معنی خیز نظروں سے۔ اور رومال سے پیروں کی گرد جھاڑتے ہوئے کہا۔
"واہ بھیّا فیضو! شادی کب کی۔ ہمیں خبر تک نہ کی۔"
فیضو نے شرما کر اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔ اور بیوی نے یہ لمبا گھونگھٹ کاڑھ لیا۔ فیضو نے شرم مٹانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔
"ہاں بھیّا۔ تُو نے تو بتایا ہی نہیں۔ بستی چھوڑ کر کیسے آنا ہُوا۔ بستی کی کیا خبر ہے۔ کیا تجھے اپنی بستی سے نفرت ہو گئی ہے۔ رحمو تو ابھی بچّہ ہے۔ اپنی بستی ان بڑے شہروں سے اچھی ہے۔ اپنے لوگ یہاں کے اچھے اچھے کپڑے پہننے والوں سے اچھے ہیں۔ بھیّا۔ اب بھی جب کبھی میں اپنی بستی اور اپنے لوگوں کو یاد کرتا ہوں تو بہت دیر

تک ، کچھ سوچنے لگ جاتا ہوں۔ اور میری آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں "۔

"فیضو بھیّا" رحمو نے بات کاٹ کر کہا۔ "تو اپنی بستی اپنے لوگ کہہ رہا ہے۔ اب اپنی بستی میں کیا دھرا ہے۔ جہاں پیٹ بھر جائے اپنی تو وہی بستی ٹھہری اب۔ تو اپنے لوگ اپنی بستی کہہ رہا ہے۔ یہ تیری بھول ہے۔ دُنیا میں اپنا کوئی نہیں۔ ایک کا رشتہ دوسرے سے کچّا دھاگا ہے۔ سُنا بھیّا۔"

اور سُنو۔ پچھلی وبا میں میرے ماں باپ دونوں مر گئے۔ چاچا خدا بخش میّت تک میں بھی شریک نہ ہو سکے۔ میرے پاس جو کچھ تھا سب کفن دفن فاتحہ تیجہ میں خرچ ہو گیا۔ ابھی باپ کی لاش کا کفن بھی مَیلا نہ ہوا ہو گا کہ چاچا خدا بخش شہر سے دو تین سوٹ بوٹ پہنے ہوئے بابوؤں کو ساتھ لیے لوٹے۔ ایک دن ایک بابو نے مجھ سے کہا۔ "قانون کی رُو سے ساری جائداد تمھارے چچا خدا بخش کی ہے"۔ کچھ نہ پوچھو بھیّا۔ اس خیال کے ساتھ ہی میرے دل پر بجلی سی گری۔ عجیب نرالا قانون ہے یہ بھیّا۔ حقدار کے گلوں پر ہی چھُری پھیرتا ہے"۔

فیضو نے رحمو پر اپنی شہریت کا رعب ڈالتے ہوئے جواب دیا۔

"ارے بھیّا۔ یہ قانون مایا کا کھیل ہے جس کی جیب گرم ہو وہ قانون بیچ سکتا ہے۔ وہ قانون توڑ سکتا ہے مُصیبت تو ہماری تمھاری ہے"۔

رحمو پھر کہنے لگا۔

"چچا خدا بخش نے تیسرے ہی روز مجھے گھر سے بے دخل کر دیا۔ پنچ نے بھی اپنا بڑا سر ہلا دیا۔ میں نے اپنا سر پیٹ لیا۔ لیکن سر پیٹ لینے سے پیٹ کی آگ بجھ سکتی ہے۔ چودھری نے شہر میں نوکری کرنے کو کہا۔ میں سمجھتا تھا۔

جس طرح تلسی کے باغ کے آم چُرانا آسان ہے۔ اسی طرح شہر میں نوکری حاصل کرنا بھی آسان ہے۔ لیکن آج چار روز سے نوکری کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہوں لیکن نوکری کا کہیں پتہ نہیں۔ تمہاری ہی تلاش تھی بھیّا۔ اچھا ہُوا تم مل گئے۔"

فیضو نے اپنی مہمان نواز طبیعت کا اس طرح مظاہرہ کیا۔

"ہاں ہاں بھیّا۔ اب تو کہیں نہ جائیو۔ ارے تُو کوئی غیر ہے۔ میرا گھر تیرا گھر ہے۔ یہیں رہیو۔"

دن گزرتے گئے۔

ایک دن شام کو فیضو کارخانے سے خوش خوش گھر کی طرف دوڑا جا رہا تھا۔ اس کی میلی چکٹ کالی نکر کی جیب میں آج ساڑھے آٹھ آنے تھے۔ ایک دم ساڑھے آٹھ آنے۔ آج وہ بہت خوش تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ رحمُو کے آگے اب کیسی ڈینگیں ماریں۔ اپنی بیوی پر اپنے تموّل کا کیسے رعب ڈالے۔ اسی قسم کے کئی خوش آئند خیالات اس کے دماغ میں بے پناہ تیزی سے گھُسے جا رہے تھے لیکن جیسے ہی گھر میں داخل ہُوا اُسے ایسا معلوم ہُوا وہ کسی آسیب زدہ ویران مکان میں گھُس آیا ہے۔ مکان میں قبرستان کی سی خاموشی تھی۔ موت کا سا سنّاٹا۔ اس کی بیوی اور رحمُو کا کہیں پتہ نہ تھا۔ اُس نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے سامنے دیوار پر دیکھا۔ ایک مکڑی ایک مکھّی کو پکڑے اپنے جالے میں گھُس رہی تھی؛

اب فیضو کی دُنیا ہی بدل گئی تھی۔ اُس کی زندگی میں نئی تبدیلی تھی۔ اُسے زندگی میں بربادیاں ہی بربادیاں نظر آ رہی تھیں۔ زندگی کی کانٹوں بھری سیج پر کانٹوں کی خلش سے وہ تڑپ رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اپنے وجود سے

زندگی اور موت کا بخیہ کرتے۔ لیکن قدرت اسے زندگی کا ایک اہم مہرہ سمجھ کر موت کی گھات سے بچا رہی تھی ؀

ایک دن تڑکے ہی وہ اپنے مکان کے آگے چارپائی پر بیٹھا ہوا تھا۔ ایک میلا گندہ شخص اس کے سر کی چمپی کر رہا تھا۔ چمپی کرنے والے نے اس کے سر پر چٹکی بجاتے ہوئے کہا۔

"چاچا۔ کچھ سُنا تم نے۔ جرمن کی جنگ پھر ہو گئی ہے۔ بھرتی ہو رہی ہے بھرتی"

"کیا کہا۔ بھرتی ہو رہی ہے" فیضو نے چونک کر پوچھا اور پھر گہری سوچ میں مستغرق ہو گیا۔

تھوڑی دیر بعد چمپی کرنے والے نے دور سے جمعدار کو آتے دیکھا۔ اور کہا "چاچا۔ جمعدار آ رہا ہے۔ اب میں چلا"

چمپی کرنے والا تیل کی رنگین شیشیاں لیے بھاگا چلا جا رہا تھا۔ جمعدار اپنی گل مُونچھوں پر ہاتھ پھیرتا ہوا آگے بڑھا۔ اس کی نظریں فیضو کے مضبوط اور گٹھے ہوئے جسم پر پھیل رہی تھیں، قبل اس کے کہ جمعدار پہلے کوئی گالی اور بعد میں کوئی کام کی بات کہے۔ فیضو نے آگے بڑھ کر کہا۔

"حضور۔ سُنا ہے۔ جرمن کی جنگ پھر ہو رہی ہے۔ میں بھی بھرتی ہونا چاہتا ہوں۔ میرا بھی نام لکھ دینا"

جمعدار نے حیرت سے اُس کی طرف دیکھا۔ اور ایک بڑے رجسٹر میں فیضو کا نام لکھ دیا۔ اور فیضو نے اپنے نام کے آگے سیاہی میں بھیگا انگوٹھا لگا دیا ؀

لندن کی آئینہ جیسی شفّاف سڑک پر فیضو اور اس کے ہندوستانی ساتھی جو بھرتی ہو کر آئے تھے۔ فوجی جرنیلوں کی طرح اکڑتے پھر رہے تھے۔ فیضو ایسا محسوس کر رہا تھا۔ جیسے کسی نے اُسے دوزخ سے نکال کر جنّت میں پہنچا دیا ہے۔ رنگین دُنیا دیکھ رہا تھا وہ۔ حسین حسین عورتیں۔ رنگ رنگ کے لباسوں میں۔ گورے گورے مرد کالے کالے سوٹوں میں۔ رنگ برنگ تیتریاں کالے کالے بھونرے۔ لیکن اس خوش باش دُنیا میں پہنچ جانے کے بعد بھی وہ ہندوستان کو نہ بھول سکا۔ وہ ایک اجنبیّت محسوس کر رہا تھا۔ اس پُر تصنّع اور بناوٹی زندگی کو دیکھ کر اسے ہندوستان کی سادہ اور فطری زندگی یاد آ رہی تھی۔ اچانک اس کی نظر سامنے سے آتے ہوئے ایک خوش باش جوڑے پر پڑی۔ مرد ایک کالے سوٹ میں ملبوس تھا اور اس کے سوٹ کا رنگ چہرے کے رنگ سے بڑا اچّھا مقابلہ کر رہا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ ایک گوری میم کی پتلی کمر کے اطراف نصف دائرہ بنا رہا تھا۔ فیضو نے اپنے دیس کی وضع قطع کا پہلا آدمی یہاں پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ اس نے اپنے ایک ساتھی سے کہا۔

"یہ بابو اپنے دیس کا معلوم ہوتا ہے۔"

اس کے ساتھی نے اُسے مذاق میں ٹال دیا۔ لیکن فیضو نے ایسا محسوس کیا۔ گویا وہ شخص ایک بڑا مقناطیس ہے جو بڑی قوّت سے اُسے اپنی جانب کھینچ رہا ہے۔ اس کے دل میں ایک نامعلوم جذبہ اُبل رہا تھا۔ اس کا دل اس کی جانب کھینچا جا رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ دوڑ کر اس کے قریب جائے اور اس سے پوچھے کہ اس کے دیکھنے پر اس کے دل کا یہ حال کیوں ہو رہا ہے۔ اسے یقین ہو گیا کہ وہ

ضرور اس کے دیس کا رہنے والا ہے۔ اس نے آہستہ آہستہ قریب جاکر اسے سلام کیا اور کہا۔

"بابو — کیا تم ہندوستانی ہو۔ میں بھی ہندوستانی ہوں۔ جنگ کے لیے بھرتی ہو کر آیا ہوں۔ مجھے اپنے دیس سے دور آج اپنے دیس کے آدمی کو دیکھ کر کتنی خوشی ہوئی ہے۔ میں —"

"بکو مت — خاموش رہو۔" اس کالے سوٹ والے بابو نے اسے جھڑک کر کہا۔ گوری میم فیضو کو، اس کے خاکی لباس کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ "کہہ رہا ہے کیا تم ہندوستانی ہو۔ ہاں ہندوستانی ہوں۔ مگر کیا تمھارے پیر پر سر رکھ دوں۔ ڈیمٹ بھاگ جاؤ یہاں سے۔"

فیضو جھینپ گیا۔ میم ہنس پڑی۔ ایک عورت کے سامنے اس کی ہتک۔ اس کے ساتھیوں کے سامنے یہ بے عزتی۔ مگر فیضو نے جھینپ مٹانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"بابو — مجھے معاف کر دو۔ میں —"

"شٹ اپ یو فول۔"

دونوں قہقہے لگاتے ہوئے چلے گئے۔ اس کے ساتھی اس کا مذاق اڑانے لگے۔ مگر وہ سوچ رہا تھا کہ پردیس میں اپنے دیس والے کو دیکھ کر جو خیالات اور جذبات فیضو کے دل میں پیدا ہوئے وہ کیوں اس کالے سوٹ والے بابو کے دل میں پیدا نہیں ہوئے۔ اس نے فیضو کو اپنا کیوں نہیں سمجھا۔ فیضو اپنے فلسفے پر غور کرنے لگا۔

صبح ہو رہی تھی۔ دھوئیں کے بادلوں کو چیرتی ہوئی سورج کی نظر نے دیکھا کہ زمین پر بڑی تباہی مچی ہوئی ہے۔ خون کی ندیاں بہہ رہی ہیں۔ لاشوں کے ڈھیر کے ڈھیر روندے جا رہے ہیں۔ زخمی اپنی کراہ سے فضا میں درد بلا رہے ہیں۔ فیضو بھی ایک ریت کے ٹیلے کے پیچھے منہ کے بل لیٹا یہ بھیانک منظر دیکھ رہا تھا۔ اچانک دشمن کا ایک سپاہی بری طرح چوٹ کھا کر اس کے قریب گرا۔ فیضو نے اپنی بندوق اٹھائی۔ اور قریب تھا کہ وہ بندوق کی لبلبی دبا دیتا مگر اس نے ایسا محسوس کیا کہ کوئی اس کے کان میں چیخ رہا ہے۔

"کیا کرتا ہے فیضو۔ ارے دیکھتا نہیں یہ تیرا بھائی ہے۔ انسان۔"

"ایک باپ کی اولاد۔ رشتہ خون کا رشتہ۔"

فیضو کی بندوق ایک دم جھک گئی۔

دشمن کے سپاہی نے فیضو کی جھکی ہوئی بندوق کو دیکھا۔ اپنی بندوق اٹھائی اور دھڑ سے چلا دی۔ فیضو نے ایک بڑی خوفناک چیخ ماری اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھا کہ :-

گرمی کی ایک لمبی سنسان دوپہر ہے۔ وہ اپنے مکان کے آگے ریلوے کمپاؤنڈ کے سائے میں چارپائی پر ٹانگیں پھیلائے سستا رہا ہے اس کی بیوی برآمدے میں چرخہ کات رہی ہے۔ اس کی بستی کا رہنے والا رحمو چارپائی پر بیٹھا اس کی بیوی کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ کر کہہ رہا ہے "یہ تیری بھول ہے فیضو بھیا۔ اپنا اس دنیا میں کوئی نہیں، ایک انسان کا رشتہ دوسرے سے گویا کچا دھاگا ہے"۔

بلیک آؤٹ

"—— اگر کسی عورت کے متعلق لکھنا چاہو تو کاغذ پہ تیتری
کے پروں کی گرد بکھیر دو۔ روشنائی کے لیے قوس قزح کے
تمام رنگ جمع کر لو —— پھر لکھو ——
عورت —— عورت —— عورت!"

سجاد نے جھنجھلا کر کتاب میز پر پھینک دی۔ اور تھکی ہوئی آنکھوں کو تراوت پہنچانے کے لیے بالکونی میں آگیا۔ آسمان کے کنارے کسی شرمائی ہوئی لڑکی کے گالوں کی طرح سرخ ہو رہے تھے۔ سانولی سلونی شام آہستہ آہستہ دھرتی پر اتر رہی تھی جیسے کوئی گھبرائی ہوئی لڑکی دبے دبے پاؤں کسی سے ملنے جا رہی ہو —— وہ مسکرانے لگا۔ جیسے کسی کی پتلی لمبی ملائم انگلیاں اس کے دل کو گدگدا رہی ہوں۔ اس کا کملایا ہوا دل کھل اٹھا اس لڑکی کی

طرح جو عین انتظار کے عالم میں اپنے چاہنے والے کو دیکھ لیتی ہو۔ اُس نے قمیض کی جیب سے ایک ٹیڑھی میڑھی سگریٹ نکالی ـــــــ

یہی ایک سگریٹ اس کے پاس رہ گئی تھی جس کو وہ کھانا کھانے کے بعد پینا چاہتا تھا۔ مگر ایسے دلآویز منظر میں وہ اپنے آپ کو بغیر سگریٹ کے دیکھ کر ایسا محسوس کر رہا تھا جیسے کوئی حُسن فروش عورت اس کو دعوت دے رہی ہے اور وہ اپنی خالی جیبیں ٹٹول رہا ہے۔ یہ تشبیہہ اس کے ذہن میں اس لیے آئی کہ بارہا اس کو ایسے واقعات سے سابقہ پڑ جاتا تھا ـــ ایک مرتبہ تو اس کو بڑی خفّت اُٹھانی پڑی تھی۔ شاہی محلّے میں اُسے ایک عورت ملی تھی جس نے خود ہی بے باک طور پر مُسکراتے ہوئے پہلے روپیہ مانگا تھا۔ پھر خود ہی اُترنے لگی تھی ـــ چودہ آنے ـــ بارہ آنے ـــ آٹھ آنے۔ اس کی جیب میں آٹھ آنے تو تھے مگر وہ عورت کی بے باک مسکراہٹ کے زہر سے خوب واقف تھا۔ بلکہ ایک بے باک طور پر مُسکرانے والی کو عورت ہی نہیں سمجھتا تھا۔ اس کے پاس عورت کا تصوّر کچھ عجیب تھا۔ جس کی مسکراہٹ میں ذرا بھی شرم گھُلی ہوئی ہو۔ وہ بلاشُبہ عورت ہے۔ اسی لیے اس نے محض اس عورت کی تذلیل کی خاطر پنواڑی کی دُکان سے ایک کیپسٹن کی ڈبیا خرید لی۔ وہ اس عورت پر صرف یہ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ وہ اس جیسی عورت کو ایک سگریٹ کی ڈبیا سے بھی زیادہ سستا سمجھتا ہے ـــــ سستی سگرٹوں کی بدولت اس کے پھیپھڑے کمزور ہو گئے تھے۔ اب سستی عورتوں کی بدولت پھیپھڑوں کے علاوہ غدود کے علاج کے لیے پیسے کہاں سے لاتا۔

اُس نے وہ ٹیڑھی میڑھی سگریٹ ہتھیلیوں سے مَل مَل کر سیدھی کی۔ اور سُلگائی ـــــ ایک گہرے کش کے بعد اس نے اپنے نتھنوں سے دُھواں خارج کیا۔ تو ایسا محسوس ہُوا جیسے دھرتی مزے میں آکر ناچنے لگی ہے ـــــ اس وقت وہ کچھ بھی نہیں سوچنا چاہتا تھا۔ بلکہ صرف اپنی تھکی ہوئی آنکھوں کو تراوٹ پہنچانا چاہتا تھا ـــــ اس کو اپنے دماغ سے بڑی چڑ تھی۔ جو ہمیشہ رنگ میں بھنگ ملا دیا کرتا تھا ـــــ خواہ مخواہ سوچنے لگتا ـــــ کہ یہاں تو تم مزے اُڑا رہے ہو اور وہاں امرتسر سے تمھارا بڑا بھائی اپنا اور بیوی بچّوں کا پیٹ کاٹ کاٹ کر تمھارے لیے ہر مہینے تیس چالیس روپے کا منی آرڈر بھیج دیتا ہے۔ یہی وہ بات تھی جس کو وہ بالکل ہی بھول جانا چاہتا تھا مگر جسے وہ بھولنا چاہتا وہی بات اسی شدّت سے اس کے دماغ میں گونجنے لگتی ـــــ اب بھی جب کہ آسمان کے کنارے کسی شرمائی ہوئی لڑکی کے گالوں کی طرح سُرخ تھے۔ کسی کی بلّوریں گردن کی سپیدی دھرتی پر پھیل رہی تھی اس کے ہونٹ مُسکرا رہے تھے۔ یہی بات اس کو یاد آ رہی تھی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ اپنی ساری بے بسی اس سگریٹ کے ساتھ زور سے زمین پر دے مارے اور ایڑی سے کچل دے ـــــ اس پیٹ اور اس اُوٹ پٹانگ باتیں سوچنے والے دماغ نے اسے کہیں کا نہ رکھا تھا۔ یہ دونوں اس کی زندگی بھینچ بھینچ کر موت کے مُنہ کا نوالہ بناتے جا رہے تھے ـــــ

اچانک اس کی نظریں سامنے والے مکان کے دریچے کی طرف اُٹھیں۔ اور مُسکراتے ہوئے گنگنانے لگا ـــــ کچھ تو ہے جس سے ہوئی جاتی ہے

چلمن رنگیں۔ تھوڑی ہی دیر بعد دو چاند کی کرنوں جیسی باہنوں نے چلمن لپیٹ کر اوپر ٹانگ دی۔ اور اپنی چوٹی کے بال کھول کر اس کی طرف کنکھیوں سے دیکھتے ہوئے کنگھی کرنے لگی ـــــــ لمبی لمبی گھنگریالی زلفیں ـــــ سجاد کا شبہ یقین میں بدل گیا تھا کہ تین مہینوں سے وہ لڑکی اپنی چور نگاہوں سے اپنی طرف چمکار چمکار کر اسے بلا رہی ہے۔ تاکہ اپنی زلفوں کے پیچ و خم میں اسے پھانس لے مگر سجاد نے اس لڑکی کے کانوں میں لٹکتے ہوئے زمرد یں بندے دیکھے تھے۔ اس کے گلے میں سونے کا جگمگاتا ہوا ہار۔ اور انگلی میں چمکتی ہوئی ہیرے کی انگوٹھی بھی دیکھی تھی۔ وہ اپنے دوست خالد کی طرح بیوقوف تھوڑی تھا کہ اتنی اونچی جگہ رومانس لڑاتا۔ جب کہ محبت ایک خالص طبقاتی جائداد ہے۔ ہیرے کی انگوٹھی پہننے والی کے شوہر کے لیے بھی ہیرے کی انگوٹھی پہننا ضروری ہے۔ سادہ لوح، جذباتی خالد نے بڑے دعوے کیے تھے۔ کہ محبت میں نہ کہیں بورژوائیت ہے اور نہ پرولتاریت ـــــــ اب ایک آئی سی ایس اس کی محبوبہ کو چھین لے گیا۔ تو لگا ہے گالیاں بکنے ـــــــ سجاد اسی لیے کھڑکی والی گلبدن کی پیچ دار زلفوں کے طول سے گھبراتا تھا۔

وہ بالکونی سے پھر اپنے کمرے میں چلا آیا۔ تکیے کے نیچے استری کی خاطر رکھی ہوئی پتلون نکال کر پہنی۔ اپنے بکھرے بالوں میں کنگھی کرنے لگا۔ وہ لڑکی ابھی تک اس کو دیکھ رہی تھی۔ سجاد نے ذرا اونچی آواز میں ایک ایکٹر کی طرح نقل کرتے ہوئے جیسے وہ لڑکی اس کی آواز کو سن ہی تو لے گی کہا۔

"جا اے دوشیزہ ـــــ کیوں وقت خراب کرتی ہے اپنا۔ اگر

جوانی سنبھلتی نہیں ہے تو ٹھنڈے پانی کے ٹب میں لیٹ جا، اور اُس وقت تک باہر نہ نکل جب تک ہیرشن اور زنویہ کا سہرا باندھے ہوئے کوئی نہ آئے اور تیرے جسم کی ساری حدّت کو آسودہ کر دے —— مجھے کیا دیکھتی ہے —— کیا میں بھی خالد کی طرح بے وقوف ہوں۔"

"اہم —— اُہم —— ہلو مائی ڈیر" خالد اپنی نئی چپلوں کی مخصوص چُرم ... چرم کے ساتھ داخل ہُوا اور سجاد نے بے ساختہ کہہ دیا۔

"شیطان کا نام لو اور وہ ——"

خالد "شیطان کھڑا ہے نا!"

کہتے ہوئے بے تکلفی سے چارپائی پر نیم دراز ہو گیا اور تکیے کو دونوں رانوں میں رکھتے ہوئے ایک مرتبہ اُچھلا۔ سجّاد کی انگلیوں سے سگریٹ چھین لی اور ایک لمبا کش لیتے ہوئے کہنے لگا۔

"حیرت ہے —— باہر لاہور کی سڑکوں پر شام دُلہن بنی پھر رہی ہے۔ اور تم اندھیری کوٹھری میں بیٹھے اونگھ رہے ہو۔ جانے کیسے افسانہ نگار ہو —— اس اندھیرے میں نہ جانے تمہیں انسپریشن INSPIRATION کیسے ہوتا ہے —— کیا یہیں کہیں کوئی ڈھونڈھ لیا ہے تم نے؟"

خالد نے بھٹکی بھٹکی نظروں سے کمرے کا جائزہ لیا۔ سجاد گھبرا گیا کہیں وہ سامنے والے مکان کی کھڑکی نہ دیکھ لے۔ مگر اس نے اطمینان کی سانس لی کیونکہ کھڑکی پر

پھر چلمن لٹک رہی تھی البتّہ اس میں سے ایک زعفرانی خاکہ صاف جھلک رہا تھا۔

خالد نے سوال پوچھتی ہوئی آنکھوں سے سجّاد کی طرف دیکھا۔

"اچھّا —— تو یہ بات ہے۔"

سجاد نے ٹالنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ——

"نہیں یار وہ تو ایک بڑھیا ہے ——"

لیکن جب خالد مصر ہو گیا تو اُس نے سب کچھ بتا دیا مگر یہ بات اس سے چھپائی کہ وہ اس لڑکی کی طرف اس لیے مائل نہیں ہوتا کہ اس کے کان میں نر مرد کے بُندے ہیں۔ البتّہ یہ کہہ دیا کہ وہ جتنی خوبصورت ہے۔ اس کی آواز اتنی ہی بھدّی اور موٹی ہے اور یہ سچ بھی تھا۔ اس کی آواز سُن کر ایسا محسوس ہوتا تھا۔ جیسے اُسے زکام ہے۔

خالد نے انگڑائی لیتے ہوئے کہا :

"یار —— آج بڑی دیر سے تمہیں ڈھونڈھ رہا ہوں۔

انار کلی —— نیلا گنبد —— مال روڈ —— لارنس گارڈن۔

غرض —— کہاں کہاں تیرا عاشق تجھے پکارہ آیا ——"؟ سجاد نے یونہی پوچھ لیا۔

"کیوں خیریت تو ہے کیا پھر کوئی نظم لکھی ہے سعیدہ کے فراق میں؟"

خالد نے مُنہ بسورتے ہوئے جواب دیا ——

"کیا خاک نظم لکھوں —— جی چاہتا ہے اسی انار کلی میں سب

کے سامنے اس کے شوہر کا گلا گھونٹ دوں مگر سعیدہ کی صورت دیکھ کر رحم آجاتا ہے ـــــ ابھی ابھی دیکھ آیا ہوں - اپنے شوہر کے پہلو میں کچھ ایسی سمٹ سمٹ کر چل رہی تھی، جیسے مرد کی یہ پہلی آغوش دیکھی ہے ـــــ سجاد نے اس کو چارپائی سے اٹھاتے ہوئے کہا ـــــ

"تو آؤ چلو ـــــ ہم بھی تو دیکھیں اس قارون اعظم کو ـــــ"

سارے لاہور میں سجاد کو صرف انارکلی ہی پسند تھی - اور اس کی شام کے تو کیا کہنے - لارنس گارڈن، شملہ پہاڑی یا مال روڈ کے بجائے وہ اپنی ہر شام انارکلی ہی میں گزارا کرتا تھا - اس کا خیال تھا کہ یہ انارکلی شہزادہ سلیم کی انارکلی کے گیسوؤں کی مانگ ہے - جو جگمگاتی دکانوں چمکیلی سواریوں، بلوری چہروں حریری لباسوں کی افشاں سے چنی گئی ہے - انارکلی میں سجاد بالکل لاأبالیانہ انداز میں گھوما کرتا تھا ـــــ اپنے آپ سے بے پرواہ جاتی اور پھر اگر کبھی اس کو ایسے وقت اپنے بھائی کی یاد آجاتی تو اس کو تصوّر ہی تصوّر میں دھوکا دے کر ذہن سے فوراً ہی نکال دیتا ـــــ کہ گھبراؤ نہیں ـــــ چند ہی روز میں وہیں امرتسر کا کلکٹر بن کے آنے والا ہوں -

ٹن ٹن ـــــ ٹن ٹن

وہ اچھل کر پرے ہٹ گیا - ایک موٹی بھدّی نوجوان لڑکی اس کی طرف غصّہ ور نظروں سے دیکھتے ہوئے پیڈلنگ کرتی نکل گئی - اس کا نارنجی دوپٹہ

انارکلی کی فضا میں انقلابی پھریرے کی طرح اُڑ رہا تھا۔ سجاد نے آہ بھرتے ہوئے کہا ——

"واہ رے حُسن برہم —— !"

خالد کے لبوں پر مسکراہٹ آگئی۔ سجاد نے اس کو مسکراتے دیکھ کر اپنی خفّت دُور کرنی چاہی۔

"مُسکراتے کیا ہو؟ —— کوئی تمہاری طرح بُدّھو ہوں کہ سعیدہ کے سدا مُسکراتے ہوئے ہونٹوں کے قریب میں آجاؤں گا —— میں تو تمتماتے ہوئے گالوں والی لڑکیوں کا دلدادہ ہوں —— بخدا شادی بھی کروں گا تو کسی ایسی ہی غصیلی ناگن سے —— "

خالد نے اپنے جواب کو طنز میں سمو کر نکالا۔

"شادی —— ! بات تو بہت بڑی کہہ دی تم نے —— ! باتوں کی حد تک تو بڑے بورڈ وا ہو —— !"

خالد کا طنز سجاد کی رُوح کی گہرائیوں میں اُتر گیا اور اس نے لاجواب ہو کر خالد سے ایک سگریٹ مانگی۔ جیسے سگریٹ کے دھوئیں کے ساتھ پھر اس طنز کو اپنی رُوح سے نکال کر اُگل دینا چاہتا ہے —— خالد نے سگریٹ دینے کے بجائے چونک کر سجاد کا ہاتھ اپنی ہتیلی میں دباتے ہوئے کہا۔

"ارے سعیدہ —— !"

ایک جگمگاتی دُکان سے سعیدہ اور اس کا شوہر باہر نکل رہے تھے۔ خالد بڑبڑانے لگا ——

سچ ہے شوپنہار سچ کہتا تھا۔

سجاد نے اپنا ہاتھ اس کی انگلیوں سے چھڑاتے ہوئے جواب دیا۔

"شوپنہار سچ کہتا ہو یا نہ ہو — مگر تم تو بے وقوف ہو۔ میں نے ہزار بار کہا کہ سعیدہ سے محبت کرنا ایسا ہی ہے جیسے ڈوروتھی لامار کی تمنّا کرنا —"

سعیدہ نے خالد کو دیکھا — ایک اُچٹتی ہوئی نظر سے — اور چُپ چاپ انجان اپنے شوہر کے پہلو میں موٹر کی لچکیلی سیٹ میں دب گئی۔

موٹر چلی گئی — سجاد نے اس کو جھنجھوڑتے ہوئے کہا —

"اب چلو بھی — کب تک اسی طرح کھڑے رہو گے —"

خالد نے غصیلی آواز میں اُس کو ڈانٹ دیا۔

"نہیں — میں کہیں نہیں جاؤں گا — یہیں کھڑا رہوں گا — ابد تک یہیں کھڑا رہوں گا —"

خالد بچّہ کی طرح ضد کر رہا تھا — بچپن ایک دوامی موسم ہے۔ انسان جوانی بلکہ بڑھاپے میں بھی بچپنا کرتا ہوا پایا گیا ہے —

"ہلو —"

"سلام علیکم —"

"نمستے —"

"آداب عرض —"

"ست سری اکال —"

سجاد اور خالد کو نوجوان چہروں، قمیضوں اور پتلونوں کے ایک گروہ نے گھیر لیا — رضی، جگجیت سنگھ، پرتھوی ناتھ اور اختر — شہر کے بدنام انارکسٹ چھوکرے! — جگجیت سنگھ نے اپنی ملائم داڑھی عادتاً کھجاتے ہوئے کہا:

"یار انارکلی تو آج ناچ رہی ہے —"

"نہیں — آج تو مال روڈ کا جمال دیکھو۔"

"کیوں آج کیا خاص بات ہے —؟"

"پلیٹ نمبر ۳۷۷ والی کار لارنس گارڈن میں گئی ہے۔"

"شوہ — بھول جاؤ پلیٹ نمبر ۳۷۷ — لکھنؤ — سے میرے گھر کے پڑوس میں ایک لڑکی آئی ہے — نہیں — وہ لڑکی بھی نہیں — بلکہ کوئی اور زیادہ لطیف نام ہو لڑکی کا تو بتاؤ — یار اس کی آنکھیں — واللہ — اگر میری آواز بھونڈی نہ ہوتی تو میں اس کو ضرور سُناتا۔

"گوری تورے نیناں کاجر بنا کارے —"

عورت — عورت — عورت!

سجاد اُکتانے لگا۔ اس کی آنکھیں عورتوں کو دیکھ دیکھ کر تھک گئیں تھیں۔ کان جیسے چوڑیوں اور پازیب کی جھنکار سے پک گئے تھے — بھئی — کیا عورت پرست ملک ہے! کتنی لمبی ہوتی ہیں ہندوستانی عورت کی کاکلیں — ایورسٹ سے راس کماری تک زلفوں کے

جال ہی جال بچھے ہیں۔ فرانس اور انگلستان خواہ مخواہ ہی بدنام ہیں۔ ذرا اس لاہور ہی کو دیکھو۔ اسی انارکلی پر کھڑے ہو جاؤ۔ ہر پانچ منٹ میں پندرہ عورتیں اور صرف پانچ مرد گزرتے ہیں —— عورتیں سبھی قسم کی —— بورژوا۔ پرولتاری، تعلیم یافتہ گنوار، شرمیلی، بے باک، زرق برق، ننگی، کالی، گوری، بیمار، تندرست، بس آنکھیں دُکھنے لگتی ہیں۔

اچانک انارکلی کی خوش سمع بھنبھناہٹ میں شور و غل سا بپا ہُوا۔ ایک تانگے کے گرد لوگ باگ جمع تھے اور تانگے والے کی فحش گالیاں سنائی دے رہی تھیں۔ ایک مسافر کھسیانا ہو ہو کر بار بار اپنی جیبیں ٹٹول رہا تھا ——

تانگہ والا ایک کلف دار طرّے والے بابو سے کہہ رہا تھا ——

بابو جی —— انصاف کرو صبح کے آٹھ بجے سے اس کو لاہور میں گھُما رہا ہوں۔ اب کہتا ہے میرا بٹوہ کہیں کھو گیا ہے —— جب جیب میں پیسے نہیں تھے تو جورو کو گروی رکھ دیا ہوتا۔

بہن کا —— ماں کا ——

مسافر کھسیانہ، مجوب، رحم طلب نظروں سے مجمع کی طرف دیکھ رہا تھا۔ لوگوں کو تو جیسے لطف آ رہا تھا۔ جگجیت سنگھ نے کہہ ہی دیا ——

"گیا ہوگا چھوٹی موٹی جان کے پاس ——"

سجاد کو اس پردیسی مسافر کے کھسیانے پن پر بڑا ترس آ رہا تھا مگر وہ بھی کیا کر سکتا تھا۔ وہ تو دیس میں رہ کر بھی اس پردیسی سے زیادہ مفلس تھا ——

تانگے والا اُونچی اُونچی آواز میں گالیاں بک رہا تھا ——

ماں کا ... ... بہن کا ... ...
جیسے قیمت وصول کر رہا ہو — سجاد نے ایسا محسوس کیا جیسے انار کلی کا نکھرا ہوا چہرہ اُتر سا گیا ہے — وہ بسور رہی ہے۔ اس نے پرتھوی ناتھ کی جیب میں بے تکلفی سے ہاتھ ڈال کر ایک سگریٹ نکالی اور اس کو سُلگا ہی رہا تھا کہ سامنے سے ایک نوجوان بنگالن ننھے سے کالے کلوٹے ہڈیوں کے ڈھیر کا ہاتھ تھامے "سلامیں" کرنے لگی۔

"ایکٹا پوائشا بابو جی — ایکٹا پوائشا۔"

جگجیت سنگھ، رضی، پرتھوی ناتھ اور خضر سب کے سب اس کو تاجرانہ نظروں سے دیکھنے لگے اور انگریزی میں تنقید کرنے لگے — اس جوانی پر جو بھیک مانگ رہی ہے — عورت سمجھ دار تھی — اس کی نظروں میں دم کے دم میں شرارے آگئے — وہ اپنے ننھے کی ہڈیوں کے ڈھیر کو گھسیٹتی ہوئی آگے بڑھ گئی — اور اس کی جگہ پر ایک بوڑھے نے اپنا لرزتا ہوا ہاتھ پھیلا دیا — جگجیت سنگھ نے نفرت سے اُسے جھڑکتے ہوئے کہا۔

"بھاگ جاؤ یہاں سے — وہ مہارانی بنگال کے کال کی ماری تھیں۔ اور یہ مہاشے شاید بیجاپور کے قحط کے مارے ہیں — کمینے"

رضی نے بنگالن کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے تائید کی۔

"ہاں جی — پنجاب میں گیہوں بہت ہوتا ہے۔"

سجاد نے ایک طنز میں گھلی ملی مسکراہٹ سے کہا۔

"اور شاید گیہوں سے شہوت بھی بہت ہوتی ہے۔"
رضی نے طنز کو نہ سمجھتے ہوئے جواب دیا۔
"— اسی لیے تو آدم جنّت سے نکالے گئے۔"
سجاد نے اپنی پتلون کی جیب سے ایک اکنّی نکال کر بڈھے کی ہتھیلی پر پھینک دی
رضی چیخا ——
"ارر —— ارے کیا غضب کرتے ہو —— بےچاری بنگالن
کو دے دیتے —— واٹ اے سالٹش بیوٹی! ——
اہاہا جیسے نمک کی کان ہو۔"
اختر نے پرکھوی ناتھ سے پوچھا ——
"ارے بھئی۔ چلتا ہے کہ نہیں۔ دیر ہو رہی ہے۔"
خالد نے پوچھا۔
"بھئی کہاں جا رہے ہو —— بڑی جلدی معلوم ہوتی ہے۔"
اختر نے جواب دیا۔
"تان سین دیکھنے جا رہے تھے —— سُنا ہے دہلی، بمبئی، حیدر آباد میں
بیس بیس ہفتوں سے دکھایا جا رہا ہے —— اور کلکتہ میں اس کی سلور جوبلی
منائی گئی ——"
خالد کو اس سے بحث نہیں تھی وہ تو کچھ اور چاہتا تھا۔
"ہیروئن کون ہے —— ؟"
"خورشید"

"اچھا ——— میں بھی چلوں گا۔ میں تو اس کی شوخی پر جان دیتا ہوں۔"

سجاد نے ان کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا ——— اس کے حساس دل میں ایک عجیب ہنگامہ سا برپا ہو گیا تھا ——— واہ رے تضاد، کلکتہ میں ہزاروں انسان دم توڑ رہے ہیں اور دوسری طرف عیش کر رہے ہیں یہ لوگ سینکڑوں سال قبل مرے ہوئے تان سین کی یاد میں فلم بنا کر اس فلم کی سلور جوبلی منائی جا رہی ہے اور ابھی ابھی دم توڑے ہوئے انسان کا جنازہ تک نہیں اُٹھا۔ خالد صاحب کو خورشید کی شوخی پسند ہے اور کل وہ بھیک مانگنے والی بنگالن پر ایک دردناک افسانہ لکھیں گے۔ رضی صاحب مشاعروں میں اپنی رسیلی آواز میں بھکارن پر نظم سُنا کر آنکھوں کو اشکبار کر دیں گے اور ایک جیتی جاگتی بھکارن اور ہڈیوں کے ڈھیر بچے کو دیکھ کر ——— خیر جانے دو ——— سجّاد نے سوچا ——— کم از کم میں اب زلفوں اور آنکھوں کے فریب میں نہیں آؤں گا ——— نہ کچھ سوچوں گا اور نہ کچھ لکھوں گا۔ ——— خورشید کی شوخی نے ہمیں بالکل بھلا دیا ہے کہ بنگال کی رانی بھیک مانگ رہی ہے۔ خورشید کی زُلفوں نے کچھ ایسا اندھیرا پھیلا دیا ہے کہ ہمیں نہ بنگال دکھائی دیتا ہے، اور نہ بیجا پور ———

ابھی شام انارکلی پر ناچ رہی تھی۔ مگر سجاد لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا گھر لوٹ آیا۔ آج اس کے دل میں بڑی ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔ وہ چاہتا تھا۔ کہ ان ٹیسوں کو الفاظ میں بھر کر کاغذ کے صفحوں پر بکھیر دے اور پھر ہر کھاتی

بیتی رُوح میں داخل کرے ؛

اس نے لیمپ جلایا۔ مگر لیمپ کی بتّی ایک چنگاری کی طرح جل کر بجھ گئی ——
کم بخت تیل ختم ہو گیا۔ کم بخت تیل ملتا بھی تو نہیں۔ ابھی مہینہ کی اور سات
راتیں باقی تھیں۔ ان سات راتوں کا اندھیرا وہ کس طرح برداشت کرے گا۔
اس کو تو صرف رات ہی میں لکھنے کی عادت تھی —— اور فرصت بھی
رات ہی کو ملتی تھی۔ مگر یہ جنگ تو ساری دُنیا پر جیسے گھٹا ٹوپ اندھیرا مسلّط
کر دے گی۔ لیمپ میں تیل نہیں —— باہر بلیک آؤٹ ——
اس جنگ کے بعد شاید سورج بھی طلوع نہ ہو۔

اس کے گھر سے قریب ایک شاعر دوست رہا کرتا تھا۔ سجاد اس سے تھوڑا
سا تیل عاریتاً مانگنے گیا مگر اس کے گھر پر بھی اندھیرا مسلّط تھا اور اس اندھیرے
میں ایک سگریٹ جلتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ سجاد نے آواز دی۔

"نوح —— او نوح۔"

"ہوں —— کیا ہے؟"

"کچھ نہیں —— اندھیرے میں طبیعت گھبرا رہی تھی۔ تمہارے
یہاں چلا آیا۔

"تو یہاں کونسا نُور برس رہا ہے —— ؟"

"خیر —— کوئی بات نہیں۔ تم تو ہو، یار کیا بتاؤں بُرا ہو اس اندھیرے کا
—— مجھے تو آج بڑا انسپریشن ——
ہو رہا ہے —— اُنگلیاں مضطرب ہیں۔ خامہ بے قرار، مگر

اندھیرا ——"

ہو ہو ہو —— ہاہاہا —— نوح ہنسنے لگا - بڑی پھیکی ہنسی تھی اس کی ——

"تو یہ کہو کہ تمھیں انسپریشن ہو رہا ہے — خوب خوب — اس اندھیرے میں تخیل آرٹ الہام انسپریشن سب فنا ہو گئے مائی ڈیر سجاد —— میں بھی رات کے اندھیرے میں کھوئے ہوئے تخیلات کو صبح کے اجالے میں ایک اندھے کی طرح ٹٹولتا ہوں —— ایک آدھ چیز ہاتھ لگ جاتی ہے —— کاغذ پر محفوظ کر لینا چاہتا ہوں مگر کاغذ کہاں ہے —— روشنائی کہاں ہے -

—— ہٹلر کوئی دوسری "میری جدوجہد (MEIN KAMPH) لکھ رہا ہے - کوئی دوسرا معاہدہ ورسائی ہونے والا ہے —— دنیا کا سارا کاغذ اسی کے لیے اسٹور کیا جا رہا ہے —— مائی ڈیر ... کسی کے ہونٹوں کا رس مل جائے گا اب روشنائی نہیں ملے گی — کسی کی کنواری لڑکی مل جائے گی — کاغذ نہیں ملے گا ——

نوح جیسے ازخفتہ ہو کر بول رہا تھا - بولتا ہی جا رہا تھا ——

اب میں نہ لکھنا چاہتا ہوں اور نہ جینا چاہتا ہوں، اب تم جاؤ —— —— میری ایک پڑوسن آنے والی ہے - اس کو ایک اٹھنی کی ضرورت ہے - —— اس کا شوہر —— بڑا لفٹنٹ بہادر ہے —— چار سال سے اپنی بیوی کو ایک اٹھنی نہ بھیج سکا —— یار میرے —— یہ لکھنا لکھانا فضول ہے —— بنگال اور بیجاپور کے قحط کے متعلق کچھ نہ سوچو - سچ کی کڑواہٹ

کوئی نہیں برداشت کر سکتا۔ بس جھوٹ بولو ——— گالیاں بکو ——— اور اندھیرے میں بھٹکتی ہوئی عورتوں کا حسن لوٹو ——— دیکھو وہ آ رہی ہے ——— اس کی صدائے پا آ رہی ہے ——— میری جان تمنّا آ رہی ہے ———

چلو بھاگ جاؤ سجّاد ——— یہاں سے چلے جاؤ ———

سجاد دروازہ ٹٹول کر باہر نکل گیا۔ اس کے قدم پھر انارکلی کی طرف اُٹھے۔ ——— یوں تو وہ اکیلا جا رہا تھا مگر ایسا محسوس کر رہا تھا جیسے نوح بھی اس کے ساتھ ساتھ چل رہا ہے ——— اور اس کے کان میں مکھی کی طرح بھنبھنا رہا ہے ——— جھوٹ بولو ——— گالی بکو ——— اندھیرے میں بھٹکتی ہوئی عورتوں کا حسن لوٹو۔۔ چھم چھم چھما چھم ——— ہٹلر دوسری مائن کامف لکھ رہا ہے۔ دوسرا معاہدہ ورسائی لکھا جانے والا ہے ——— ہونٹوں کا رس جل جائے گا روشنائی نہیں ملے گی ——— ہر پانچ منٹ میں انارکلی سے پندرہ عورتیں گزرتی ہیں۔ مگر مرد صرف پانچ ——— باقی دس مرد کہاں گئے۔ اپنی بیویوں کو اٹھنی بھی نہ بھیج سکے ——— بڑے آئے لفٹننٹ بہادر کہیں کے ——— !"

"اخاہ میاں سجاد ——— بہت دنوں بعد ملے ہو۔"

سجاد نے مڑ کر دیکھا ——— مولانا آبرو ——— گل و بلبل کے عاشق ——— داغ کے شاگرد ——— خضاب میں رنگی داڑھی ——— پان کی پیک سے سرخ ہونٹ ——— عمر ساٹھ پینسٹھ مگر آنکھوں میں تو دم

ہے ـــــ سجاد کو گھسیٹ کر دلّی مُسلم ہوٹل میں لے گئے ـــــ ہوٹل کی دیوار پر ایک بورڈ آویزاں تھا ـــــ

"براہ کرم یہاں سیاسی اور فوجی گفتگو نہ کیجیے۔"

سجاد نے یہ بورڈ ہر جگہ دیکھا تھا ـــــ ریل کے ڈبّوں، کلبوں میں ـــــ لکچر رُومس میں، ہوٹلوں میں مگر آج کچھ ایسا محسوس کر رہا تھا جیسے بالکل پہلی بار یہ بورڈ دیکھ رہا ہو ـــــ اُس نے مولانا سے فرمائش کی ـــــ

مولانا ـــــ کوئی غزل سُنائیے جس میں کسی بڑی ہی شوخ عورت کا ذکر ہو ـــــ"

مولانا نے حیرت سے سجاد کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا ـــــ

"کیوں بھئی ـــــ خیر تو ہے ـــــ آج طبیعت عورت کی طرف بہت مائل نظر آتی ہے ـــــ سگمنڈ فرائیڈ کے فرزند ـــــ ؟"

سجّاد نے اُکتا کر کہا ـــــ

مولانا شاید سگمنڈ فرائیڈ کے سوا اور کوئی نام آپ کو یاد ہی نہیں ـــــ ـــــ مگر آپ مطمئن رہیں۔ سگمنڈ فرائیڈ سے مجھے نفرت ہو گئی ہے۔ آپ نے اس کی تصویر دیکھی کبھی ـــــ

ہی ہی ہی ـــــ مولانا بقول خود "تبسّم" فرمانے لگے ـــــ مگر بھئی بات کچھ اور ہی معلوم ہوتی ہے ـــــ"

سجاد نے مولانا کی پان کی ڈبیہ سے ایک پان نکال کر چباتے ہوئے کہا۔

"قبلہ ـــــ بات وات کچھ نہیں۔ مگر یہ سامنے بورڈ دیکھ رہے ہیں آپ۔

سیاسی اور فوجی بات نہ کرو ــــ اور یہی کمبخت موضوع تازہ موضوع ہے
ــــ مگر میں وفادار ہوں ــــــ اسی لیے ــــــ
آپ سے ــــــ غزل سنانے ــــــ کی ــــ
فرمائش کی ــــــ یا مولینا ــــ گستاخی معاف ــــ
آئیے آج ہم ــــ نئی نئی گالیاں ــــــ ایجاد کریں
ــــــ بڑے لچک دار ــــــ موضوع ہیں
یہ دونوں ــــ گالی اور عورت ۔"
مولانا نے چوٹ کرتے ہوئے کہا۔
"ہاں ــــ ترقی اسی کا نام ہے ۔"
سجّاد مولانا سے بیزار ہو گیا تھا مگر کہنے لگا۔
آپ سچ کہتے ہیں ــــ اور وہ امریکن ــــ جرنلسٹ
ایڈگر اسنو بھی سچ کہتا ہے کہ ہندوستان کو چاروں ــــ آزادیاں
حاصل ہیں ــــ بالخصوص ــــ آزادیٔ گفتار
تو پوری طرح حاصل ہے ــــ ابھی ابھی اناہ کلی پہ
ایک تانگے والا ایک پردیسی مسافر کی ماں اور بہن کی آبرو کس مزے سے
لوٹ رہا تھا ــــ آپ سنتے تو لطف اٹھاتے مولانا ــــ
مولانا نے ناراضی سے سجّاد سے پوچھا۔
"میاں ــــ ہوش میں تو ہو ــــ بہت پی لی ہے کیا ــ؟"
سجّاد نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا ــــ

آج ایک نئی شراب پی ہے ——— آزادئ گفتار ہے اسی کا نام۔
اب ایک عورت کی ضرورت ہے۔ کوئی عورت کالی ——— پیلی، موٹی،
دُبلی، بیمار ——— بس وہ عورت ہو ——— میری جیب
میں ایک ——— اٹھنّی بھی ہے اور سارا لاہور ——— بلیک آؤٹ
میں ڈُوبا ہُوا ہے۔

مولانا ——— ہو ہو ہو ——— ہو ہو ہو۔

اور وہ نوح کی ہنسی کی نقل اُتارنے لگا ❊

تنخواہ کا دن

آج مزدوروں کے چہروں پر خلافِ معمول تازگی اور توانائی جھلک رہی تھی۔۔آج سب مستعدی دکھلا رہے تھے۔آج کسی کو تھکن محسوس نہیں ہو رہی تھی۔۔آج کسی کو بخار نہیں تھا۔۔۔۔ آج ان کی تنخواہ کا دن تھا۔

مراد تپتے ہوئے سُرخ لوہے کے ٹکڑوں پر ہتھوڑے برساتے ہوئے کچھ سوچ سوچ کر آپ ہی آپ مُسکرا رہا تھا۔کھٹا کھٹ کھٹا کھٹ ایسے زور زور سے ہتھوڑے برسا رہا تھا کہ گویا وہ سُرخ لوہے کے ٹکڑے مہینہ کے پچھلے مفلسی کے دن ہیں جن سے وہ اپنا پورا پورا بدلہ لے رہا ہے۔تیس دن میں یہ تنخواہ کا ایک دن ہی تو ایسا آتا ہے۔جب یہ سب دُکھ بھول جاتا ہے ــــ صرف اسی ایک دن اُسے یہ دُنیا ــــ یہ دُنیا والے ــــ بیوی بچے سب پیارے معلوم ہوتے ہیں ــــ صرف اسی ایک دن وہ خوب جی بھر کر محنت کرنا چاہتا ہے۔

——— جان توڑ کر کام کرنا چاہتا ہے۔ اور باقی اُنتیس دن ——— ؟

ہُونہہ باقی اُنتیس دن کی آج ذکر کیوں ؟

آج تو اس کی تنخواہ کا دن تھا۔

مہینے بھر کی تنخواہ ——— اکٹھے دس روپیہ ——— چاندی کے چمکتے ہوئے دس سکّے ——— انہی پر تو دُنیا قائم ہے ——— انہی کے لیے تو چوٹی کا پسینہ ایڑی تک بہایا جاتا ہے۔ کیا راجہ کیا پرجا، یہ چمکتے ہوئے سکّے ہی قسمتوں کو چمکاتے ہیں۔ آج اس کی بھی قسمت چمکنے والی تھی ——— !

آج چمک دار سکّوں سے جگمگاتا ہُوا تنخواہ کا دن تھا۔

مراد کو آپ ہی آپ مُسکراتا دیکھ کر اس کے ایک ساتھی مزدور نے اس کے گنجے سر پر ایک چپت لگائی۔ مگر مراد مسکراتا ہی گیا ——— آج وہ کسی سے لڑنا نہیں چاہتا تھا، اگر اس کا ساتھی ننھّے بچے کی طرح اس کے کاندھے پر بھی سوار ہو جائے تو مراد مُسکراتا ہی جائے گا ——— مُسکراتا ہی رہے گا ——— !

تیس دن تک اپنے جسم کی طاقت کارخانے کو بیچتا رہا۔ آج اس کی ساری بیچی ہوئی طاقت چاندی کے سکّوں میں تبدیل ہو کر اسے ملنے والی تھی ———

آج وہ خوب ٹھاٹھ اُڑائے گا ——— لاٹ صاحب کے سے ٹھاٹھ ———

آج اس کے گھر میں گوشت بھُونا جائے گا جس کی خوشبو جب محلّے کے ہر گھر میں پہنچے گی تو سب کو معلوم ہو جائے گا کہ آج مراد کے گھر میں مزے مزے کے کھانے کھائے جا رہے ہیں۔ آج دو وقت کی بجائے امیروں کی طرح وہ بھی تین وقت خوب ڈٹ کر کھائے گا۔ بیوی بچّوں کے لیے کپڑے خریدے جائیں گے۔ آج

بیڑی کی بجائے ٹھنڈا چھاپ سگریٹ پیا جائے گا ـــــ آج شکنتلا کا ناٹک بھی دیکھا جائے گا ـــــ!

"اُوں ـــــ اُو ـــــ اُو ـــــ اُو ـــــ"

کارخانے کا گھگھو پکار رہا تھا۔

تمام مزدور اُچھل پڑے۔ اپنا اپنا کام چھوڑ منیجر کے دفتر کی طرف دوڑنے لگے۔ مراد بھی اپنا ہتھوڑا پھینک ان میں جا ملا۔

آج منیجر کی بھی تنخواہ کا دن تھا۔ منیجر کی تنخواہ آٹھ سو روپے تھی۔ مراد نے اپنے ایک ساتھی سے پوچھا۔

"ارے بھیّا! یہ منیجر آٹھ سو روپے لے کر کیا کرتا ہوگا۔ اس کے نہ تو بیوی ہے نہ بچّہ، اس کے پاس تو خوب روپیہ جمع ہو گا۔ دن تمام دفتر میں بیٹھا رہتا ہے۔ نہ کام نہ کاج۔ مگر مہینے کے مہینے ٹھنا ٹھن آٹھ سو روپے مل جاتے ہیں، ہم صبح کے پانچ بجے سے شام کے چھ بجے تک کارخانے میں مرتے رہتے ہیں، مگر وہی دس روپے۔"

اس کے ساتھی نے جواب دیا۔

"بھیّا وہ مانیجر ہے مانیجر سمجھا!"

مراد خاموش ہو رہا۔ ایسے جیسے اس کا جواب ایک ناقابلِ انکار دلیل ہے۔

مراد جب تنخواہ لے کر کارخانے سے باہر نکلا تو سڑکوں پر بجلی جل چکی تھی، دکانیں جگمگا رہی تھیں، موٹریں دوڑ رہی تھیں۔ ٹرامیں گھڑگھڑا رہی تھیں، سائیکلیں ٹن ٹنا رہی تھیں، ریڈیو تانیں اُڑا رہے تھے۔ گراموفون بج رہے تھے۔ ہر طرف شور ہی شور تھا، ہر طرف ہنگامہ ہی ہنگامہ تھا، ایک بڑی دکان سے ایک صاحب

اور ایک ہیم اُٹ مُٹا کر باہر نکلے، ایک فقیر نے ان کے آگے ہاتھ پھیلا دیئے مگر صاحب نے گھُرکی بتائی، وہ رُٹ چکے تھے، مگر مُراد آج مالدار تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر فقیر کے ہاتھ میں ایک پیسہ پکڑا دیا۔ جیسے اب دُنیا سے صاحبوں کا راج ختم ہو گیا ہے۔ اور مزدور راج کا آغاز ہوا ہے۔ فقیر اسے دُعائیں دینے لگا۔ مُراد دیر تک وہیں کھڑا دعائیں سُنتا رہا۔ وہ جی بھر کر دعائیں سُننا چاہتا تھا۔ اس کا دل پھُولا نہیں سمارہا تھا، اچانک وہ چونک پڑا اُسے کوئی پکار رہا تھا:۔

"ارے مراد بھیا! ذرا سُنیو تو —— "

مراد نے پلٹ کر دیکھا۔

شمسو پنواڑی تھا۔ اپنی اُونچی دُکان کے میلے آئینے کے آگے بیٹھا قینچی سے پان کے ڈنٹھل کتر رہا تھا، اس کے گنجے سر پہ بجلی کا ایک چھوٹا سا گولا جل رہا تھا۔

مراد نے قریب پہنچ کر پوچھا۔

کیا ہے بھیا —— آج تیری صورت اُتری کیوں جا رہی ہے۔"

"ارے کیا بتاؤں بھیا! ابھی ابھی رحیمن کے لڑکے نے آکر خبر دی کہ میری بھابی کا منجھلا لڑکا مر گیا۔ تُو تو جانتا ہی ہے بھیا۔ اس کو سردی کا بخار ہو گیا تھا۔ نمونیا —— ڈاکٹر نے کہا تھا کہ گرم کپڑے پہناؤ اسے۔ بھلا یہ پان کی دُکان میں ایسا کہاں کا منافع کہ گرم کپڑے خریدوں۔ تین وقت کی روٹی کا اپنا ٹھکانہ نہیں۔ آخر ننھی سی جان مر ہی گئی۔ جرا بھیا تو یہاں پر بیٹھ رہیو، میں جری گھر ہو آؤں۔"

مُراد نے کچھ سوچتے ہوئے سر ہلا دیا۔ اُونچی دُکان پر بیٹھ کر وہ سوچنے لگا، اس

کا بھی ایک بچّہ ہے، آٹھ برس کی ننھّی جان، اس کے پاس بھی گرم کپڑے نہیں ہیں، ـــــ آج کل سردی ایسی غضب کی پڑ رہی ہے کہ جس کو دیکھو سردی کے بخار سے آڑا پڑا ہے ـ اس کو فوراً اپنے لڑکے کے لیے گرم کپڑے خرید لینے چاہئیں ـ اس کے خیالات بھٹکنے لگے ـ

سردی کے بعد پھر گرمی آئے گی ـ پچھلی گرمیوں میں ننھّا کہتا تھا کہ مدرسے کو جانے میں اُس کے پیر جلتے ہیں ـ وہ ننھّے کو جاپانی ربڑ کا سفید جوتا لے دے گا گرمی کے بعد برسات آئے گی ـ ننھّا برسات میں بھیگ جائے گا تو اُسے سردی کا بخار ہو جائے گا ـــــ رجب کے لڑکے کے پاس چھوٹی کالی چھتری ہے وہ بھی ننھّے کے لیے ایک چھوٹی کالی چھتری خرید لے گا ـ مگر اب تو اسے گرم کپڑے جلد سے جلد خرید لینے چاہئیں ـ ورنہ ـ ـــــ سردی کا بخار ـــ نمونیا ـــــ اور موت ـــــ !

وہ کچھ گھبرا سا گیا ـ

اسی اثنا میں شمسو پنواڑی لوٹ آیا ـ اس نے دُکان بند کر دی ـــــ دونوں اپنے اپنے گھروں کو چل دئیے ـ مراد جب گھر کے قریب پہنچا تو اُس نے دیکھا کہ سیٹھ ہری داس چارپائی پر بیٹھے اس کا انتظار کر رہے ہیں ـــ باپ رے باپ ـــــ اُس نے ایسا محسوس کیا کہ اس کی رُوح اچانک مُردہ ہو گئی ہے، سیٹھ کا قرضہ دینا ہے، گیہوں، نمک، تیل جو بھی قرض لیا تھا ـ ان کے پیسے دینے ہیں ـ یہ سیٹھ کل تک صبر نہ کر سکے، وہ جانتے تھے کہ ان مزدوروں کے پاس آج پیسہ آیا، کل ختم ـــــ رات کے ساڑھے آٹھ بج گئے مگر یہ جھوٹ

شیطان کی طرح پہرہ جمائے بیٹھا ہے۔ مُراد نے آگے بڑھ کر کہا۔
"سیٹھ جی سلام۔ آج ذری دیر ہو گئی سیٹھ، معلوم ہوتا ہے تم بہت دیر سے بیٹھے ہو۔ ہاں سیٹھ! تمہارے کتنے روپے ہیں"؟

"چھ روپے۔"

مُراد نے ایسا محسوس کیا گویا کسی نے اس کے مُنہ پہ زور سے تھپڑ لگا دیا ہو۔ مگر وہ سنبھلا اور کہنے لگا۔

"سیٹھ! اس مہینے تین روپے لے لو۔ اگلے مہینے سب حساب ہو جائے گا۔"

"نہیں، نہیں، ہر مہینے تُو ایسا ہی کہتا ہے۔ مجھے تو اس مہینے میں بڑی تنگی ہے۔ میری ماں کاشی جا رہی ہے، اُسے روپوں کی ضرورت ہے، باپ کی چتا کی ہڈیاں دو مہینے سے گھر ہی میں رکھی ہیں، اس مہینے ماں انہیں ضرور کاشی لے جائے گی ـــ اس مہینہ میں تُو دے ہی دے۔ ورنہ پھر مہینہ بھر کچھ اُدھار نہیں ملے گا۔"

سیٹھ کی دھمکی کامیاب ہو گئی۔ مہینہ بھر اُسے اُدھار ہی تو کھانا ہے اب اگر وہ نہ دے، تو سیٹھ مہینہ بھر کچھ بھی نہ دے گا ـــ اس نے بے وجہ جھلّا کر چھ روپے سیٹھ کے حوالے کر دیئے۔

سیٹھ روپیہ لے کر بجلی کے کھمبے تک بھی نہ گیا ہو گا۔ کہ ایک اور خدائی فوجدار وارد ہوا۔ گوبند بابو کا نوکر تھا اور مکان کا کرایہ وصول کرنے آیا تھا۔ مکان کا کرایہ دو روپے، ایک دم دو روپے۔ ایسے غلیظ مکان کا کرایہ

جس میں دو اندھیرے کمرے —— دھوئیں سے کالی دیواریں —— ٹوٹے چھپّر کا دالان جو برسات میں تالاب بن جاتا تھا۔ چار قدم کا صحن، سنڈاس تک موجود نہیں مگر کرایہ دو روپے، اور مہینے کے مہینے وصول ہوتا ہے۔ خواہ مخواہ کا غصّہ مراد کے جسم میں سرایت کرنے لگا —— مگر کس پہ غصّہ کرے وہ بے چارا —— اس نے بڑبڑاتے ہوئے دو روپے اس طرح اس نوکر کے ہاتھ میں تھما دیئے گویا وہ دو روپے انگارے تھے۔ جن کی جلن کی وہ تاب نہیں لا سکتا تھا۔ دانت چباتا اوّل فول بکتا گھر میں گھسا۔ اس کی بیوی آج بنی سنوری بیٹھی تھی کیونکہ اُسے معلوم تھا کہ آج تنخواہ کا دن ہے —— مگر مُراد نے اس کی طرف نگاہ تک نہ کی —— بچّہ چارپائی پہ سو رہا تھا۔ مٹی کے تیل کے چراغ کی روشنی میں چمکتے ہوئے اس کے سانولے چہرے میں مراد جیسے باپ کے لیے بہت دلکشی تھی۔ مگر اس نے مُنہ پھیر لیا۔ اور قریب پڑی ہوئی چارپائی پر بیٹھ کر دونوں ہاتھوں میں اپنا سر دیئے سوچنے لگا:۔

سردی —— گرم کپڑے —— گرم جاپانی ربڑ کا جُوتا ——

برسات —— چھوٹی کالی چھتری ——

اس وقت ایک ہلکی سی —— خوشبو ہوا کے دوش پر بہتی ہوئی اس کے گھر میں بھی بھٹک نکلی۔ اس کی بیوی نے ہونٹوں پر تر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

"آہا —— سُونگھتے ہو، آج شرفو ڈرائیور کے گھر گوشت بُھنا جا رہا ہے۔"

"ہونہہ" اُس نے نفرت سے چڑ کر کہا۔

اسی اثنا میں شرفو بھی دندناتا ہوا اُس کے گھر میں گھس آیا۔ شرفو ایک بڑے کرسٹان کا موٹر ڈرائیور تھا۔ اس کی تنخواہ چالیس روپے تھی۔ آج اس کی بھی تنخواہ کا دن تھا۔ آج وہ بیڑی کے بجائے جھنڈا چھاپ سگریٹ پی رہا تھا۔ وہ مراد سے کہہ رہا تھا کہ وہ شکنتلا کا ناٹک دیکھنے جا رہا ہے۔

مُراد کے مُنہ سے ایک ٹھنڈی آہ نکلی۔ وہ اپنے گھر ہی میں بیٹھے بیٹھے ایک ناٹک دیکھ رہا تھا۔ ایک دُکھ بھرا ناٹک۔ جسے شرفو نہیں دیکھ سکتا تھا۔ کیونکہ آج اس کے گھر گوشت بھُونا جا رہا تھا۔ اور وہ بیڑی کے بجائے جھنڈا چھاپ سگریٹ پی رہا تھا ۔

آنسو جو بہہ نہ سکے

فہمیدہ نے ساری سہیلیوں میں اپنے شوہر کو بدنام کر رکھا تھا۔ اگرچہ اس کا شوہر ویسا نہ تھا۔ وہ تو فطرتاً فہمیدہ کے پالتو "کتے" سے بھی زیادہ مسکین تھا۔ اور کچھ عجیب سی بات یہ بھی تھی کہ اس کا نام غریب خاں تھا۔ فہمیدہ کو خود غریب خاں پر بڑا ترس آتا تھا کہ میں نے بیچارے کو خواہ مخواہ بدنام کر رکھا ہے کہ وہ ایک سخت گیر غصّیلا اور وہمی انسان ہے جو اپنی بیوی کو گھر سے نکلنے کسی سہیلی کے گھر آنے جانے یا محلّے کی کسی تقریب میں شریک ہونے سے منع کرتا ہے۔ فہمیدہ کی سہیلیوں کا خیال تھا کہ اس کے مقناطیسی حسُن نے غریب خاں کو وہمی بنا دیا ہے لیکن ادھر بیچارے غریب خاں کو کچھ بھی معلوم نہ تھا کہ اس کی بیوی اس کی پیٹھ پیچھے کیا ناٹک کھیل رہی ہے اور کیوں ——؟

ان کی شادی ہوئے کوئی چار سال ہونے کو آئے تھے مگر دونوں میں شاید

ہی کبھی لڑائی ہوئی ہو' اس نے شاید ہی اپنی بیوی کو کبھی سخت سُست کہا ہو۔ اس کو تو اپنی بیوی سے کچھ ایسا پیار تھا کہ وہ سمجھنے لگا تھا کہ مفلسی اور غلامی کے مہیب اندھیرے میں جو تھوڑی بہت روشنی ہے وہ فہمیدہ کے چہرے کے چاند آنکھوں کے ستاروں اور رُخساروں کی شفق سے وجود میں آئی ہے جو غریب خاں کو عمرِ طبعی تک زندہ رکھنے کے لیے بہت کافی ہے۔ کبھی کبھی اگر دونوں میں کچھ لڑائی بھی ہو جاتی تو سرِ شام جل اُٹھنے والی لالٹین کے مدھم اُجالے میں اپنی لڑائی کا سبب بھول کر وہ اکٹھے بستر پر لیٹ جاتے۔ جیسے میل ملاپ کرنے کے لیے ہی لڑ پڑے ہوں ... اور غریب خاں کا تو یہ خیال تھا کہ لڑائی تو بڑے آدمیوں کی خصوصیت ہے ؛

غریب خاں کی عمر تیس برس ہونے کو آئی تھی مگر اس کے سانولے سلونے تیکھے خطوط والے چہرے پر کچھ ایسی معصومیت اور بھولپن تھا کہ بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ابھی اس کی شادی نہیں ہوئی ہے۔ یا وہ عورت مرد کے تعلقات کے متعلق بہت کم، یونہی سرسری معلومات رکھتا ہے۔ شادی سے پہلے نہ وہ کسی لڑکی کی طرف مائل تھا اور نہ شادی کے بعد وہ کسی دوسری لڑکی کی طرف متوجّہ ہُوا۔ شادی سے پہلے اس نے کبھی نہ فہمیدہ کو دیکھا تھا اور نہ دیکھنے کی آرزو رکھتا تھا۔ اس کی جوانی جیسے صرف ایک عورت کی محتاج تھی ـــــ کوئی عورت۔ فہمیدہ کی بجائے اگر کوئی بدصورت عورت بھی اس کے پلّے پڑ جاتی تو وہ راضی برضا رہتا۔ اس کی نیت نیک تھی۔ قدرت نے بھی اس کی پسلی سے فہمیدہ جیسا حُسن تخلیق کیا ـــــــــ شادی کے کچھ عرصہ بعد ہر نوجوان

اپنی بیوی سے بیزار سا ہو جاتا ہے لیکن غریب خاں چار سال کے طویل عرصہ کے بعد بھی بیزار نہ ہوا۔ اب بھی جب وہ اپنی بیوی کی صورت دیکھتا تو اُس کی بیوی محسوس کرتی کہ اس کی نظروں کا زاویہ وہی ہے جو اس رات تھا۔ جس رات پہلی بار اُس نے فہمیدہ کا گھونگٹ اُلٹا تھا۔ ایسی پیاری رجسٹ پسندی اور بھولپن نے فہمیدہ کے دل سے اس کی خالہ کے لڑکے کا خیال بالکل ہی بھلا دیا تھا جس سے شادی کرنے کی فہمیدہ کو بڑی آرزو تھی۔ فہمیدہ نے جب غریب خاں کی پہلی مسکراہٹ دیکھی تھی تو کچھ ایسی ریجھ گئی تھی کہ اس کو محسوس ہونے لگا تھا کہ اس کے شوہر کی خمیر خاک نہیں بلکہ موم ہے جو کسی جنم میں بھی اس کو سخت گیر غصّیلا اور وہمی نہیں بنا سکتی۔ مگر اس کو اس طرح مشہور کرنے میں فہمیدہ کا بھی کوئی قصور نہیں تھا۔ وہ بالکل حق بجانب تھی۔ اُس نے فاطمہ کو بتایا تھا کہ اس کا شوہر ہر رات اس کو بے وجہ پیٹا کرتا ہے۔ رفیعہ سے کہا تھا کہ کسی کے گھر آنا جانا اس کو قطعاً پسند نہیں۔ زمرد کو سنایا تھا۔ کہ وہ کہتا ہے کہ محلّے کی تقریبوں میں بڑی بے پردگی ہوتی ہے ——— ——— یہ سُن کر اس کی سہیلیاں بجائے متحیر ہونے کے کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ اور زمرد نے تو غریب خاں کا نام بدل کر "عجیب دغریب خاں" رکھا تھا جس دن زمرّد نے غریب خاں کا یہ نیا نام تجویز کیا تھا۔ اس دن فہمیدہ کے گھر ایک بڑی کامیڈی ہوئی۔ اس کامیڈی کا آغاز غریب خاں کی تنخواہ سے ہوا ——— مضمحل، خالی خولی اور رینگنے والی زندگی میں روپے کی گرمی سے جو توانائی اور چستی اور حرکت پیدا ہو گئی تھی اسی کیفیت نے غریب خاں کے

دل میں جلد سو رہنے کے بجائے فہمیدہ سے باتیں کرنے یا اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتے رہنے کی ایک خواہش پیدا کر دی تھی مگر مشکل یہ آن پڑی تھی کہ آخر کس موضوع پر باتیں کی جائیں۔ میاں اور بیوی چوبیس گھنٹے کے ساتھی ہوتے ہیں۔ جتنے موضوع غریب خاں اور فہمیدہ کی دلچسپی کے باعث تھے۔ وہ شادی کے ایک سال کے اندر اندر ختم ہو گئے تھے اور اب جن موضوعوں پر غریب خاں گفتگو کرنا چاہتا تھا۔ وہ فہمیدہ کی فہم سے باہر تھے۔ کیونکہ فہمیدہ ایک پرائمری پاس عورت تھی۔ اور غریب خاں ہندوستان کی ایک بہت بڑی یونیورسٹی کا گریجویٹ جو کلکٹر بننا چاہتا تھا۔ مگر تقدیر کو انسانی دسترس سے دُور پا کر کلرک بن گیا تھا۔ اب رہا آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے کا مرحلہ ———— میاں اور بیوی کی گفتگو کا یہ ایک بڑا ہی رومانوی ڈھنگ ہے۔ مگر غریب خاں فطرتاً بڑا ہی شرمیلا واقع ہُوا تھا۔ صبح داڑھی مُونڈتے وقت آئینہ میں زیادہ دیر تک اپنی صُورت آپ دیکھ کر شرما جاتا تھا۔ بھلا بیوی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے کی ہمّت اس میں کہاں! لیکن پھر بھی غریب خاں کی طبیعت چاہتی تھی کہ آج نچلّا نہ بیٹھا جائے۔ زبان خاموش نہ رہے۔ طبیعت میں اضمحلال نہ پیدا ہو۔ کیونکہ تنخواہ کا دن آنگن میں مُسکرانے والے گلاب کے پھول کی طرح رنگین مگر پہلی تاریخ کے چاند کی طرح جلد غروب ہو جاتا ہے، غریب خاں کو اس لفظ "غروب" سے بڑی چڑ تھی۔ اس کا خیال تھا کہ یا تو کوئی چیز طلوع ہی نہ ہو یا اگر طلوع ہو جائے۔ تو پھر غروب نہ ہو۔ یہ چیز اگر اس کے اختیار میں

ہوتی تو وہ ہر روز گیبرڈین کی ایک ہی پتلون نہ پہنتا۔

غریب خاں نے گفتگو کا موضوع سوچتے سوچتے یوں ہی غیرارادی طور پر فہمیدہ پر نظر ڈالی اور دیکھا کہ فہمیدہ کی بڑی بڑی آنکھیں اس کے اپنے چہرے پر گڑی ہوئی ہیں۔ غریب خاں کچھ گھبرا سا گیا۔ مگر عام مردوں کی طرح عورت کی موجودگی میں مرد کی شکست اس کو بھی منظور نہ تھی۔ اسی لیے اُس نے جلدی جلدی کہنا شروع کیا۔

"فہمیدہ ـــــ بھئی عجیب بات ہے۔ نہیں معلوم اس گھر میں تمہارا جی کیسے لگتا ہے۔ جب سے آئی ہو۔ بس قید ہو۔ نہ کسی سہیلی سے ملنے جاتی ہو۔ نہ محلّے کی کسی تقریب میں شریک ہوتی ہو۔ میں نے اس دن سینما چلنے کو کہا ـــــ تم نے صاف اڑا دیا۔"

غریب خاں نے لہجہ بدل کر مسکراتے ہوئے گفتگو مکمّل کی۔

"آج سے میں تمہیں فہمیدہ کی بجائے "عجیب غریب بیگم" پکارا کروں گا۔"

چھن ـــــ فہمیدہ کی چوڑیاں بج اُٹھیں۔ وہ چونک پڑی تھی۔ اور پھر اُس کے مُنہ سے بے ساختہ قہقہے اُبلنے لگے تھے۔ یہ قہقہے انسانی آواز کے بڑے رسیلے اور سُریلے نمونے تھے۔ غریب خاں سمجھا کہ اس کا مذاق بہت کامیاب رہا۔ بیوی کو مُدّتوں بعد آج کھل کر ہنستا دیکھ کر وہ سوچنے لگا کہ ہنستے وقت فہمیدہ کیسی لال گلال ہو جاتی ہے۔ اس کی ہمیشہ بیمار رہنے کی شاید یہی وجہ ہے کہ اس کو نہ کوئی ہنساتا ہے اور نہ اس کے خون میں ایسا تموّج پیدا ہوتا ہے۔ اس کو اپنی ایک بڑی ہی سخت غلطی کا احساس ہُوا کہ آج تک وہ فہمیدہ

کی طرف سے کتنا لا پرواہ رہا ہے، آج کی طرح پہلے نہ کبھی ہنسایا ہے۔ اور نہ اس کو خوش رکھا ہے۔ اگر شروع ہی سے وہ ازدواجی ذمہ داریاں سمجھتا ہوتا تو کیا فہمیدہ کے جسم میں خون کی کمی ہوتی ـــــ اُس نے تہیہ کر لیا کہ آئندہ سے وہ ہر روز اپنی بیوی کو ہنسائے گا۔ فہمیدہ اگر روز اسی طرح ہنستی رہے گی تو اس کو پھر کسی ڈاکٹر کی خوشامد کی ضرورت نہ ہوگی۔

فہمیدہ کے قہقہے رُکے مگر مسکراہٹ ہونٹوں سے نیاری نہ ہوئی جیسے مسکراہٹ کو مُدتوں سے ایسے پیارے ہونٹوں کی تلاش تھی۔ اس مسکراہٹ میں کچھ معنی بھی چھپے ہوئے تھے یعنی عجیب و غریب خاں کی عجیب و غریب بیگم لیکن یہ کیسا اتفاق ہے۔ کیا غریب خاں کو اس کا نیا نام معلوم ہو گیا تھا۔ مگر یہ ناممکن ہے کیونکہ غریب خاں اس وقت دفتر میں تھا۔ اور دفتروں میں کام کرنے والوں کی معلومات بہت محدود ہوتی ہیں۔

غریب خاں بڑی مشتاق نظروں سے فہمیدہ کو دیکھ رہا تھا۔ فہمیدہ نے اس کے سوال کا جواب نہ دیا۔ نہ سہی۔ وہ کھُل کر ہنسی تو۔ یہی غریب خاں کی معراج تھی۔ اور فہمیدہ یہ سوچ رہی تھی کہ اس نے بڑا اچھا کیا کہ وہ راز نہ بتایا جس کی وجہ سے جب سے وہ اس گھر میں آئی تھی قید ہو کر رہ گئی تھی۔ فہمیدہ بڑی فہم والی عورت تھی اور جب اُسے اپنے نام کے مفہوم سے آگاہی ہوئی تھی۔ وہ اپنے نام کی لاج برابر نباہتی رہی تھی۔ اس نے غریب خاں کے سوال کے جواب میں قہقہے لگائے جن کا مطلب یہ تھا کہ وہ اسی قید میں بڑی مسرور اور قہقہہ بردوش زندگی بسر کر رہی ہے۔ پھر باہر جانے سہیلیوں سے ملنے

بلائے اور محلّے کی تقریبوں میں شریک ہونے کی کیا ضرورت ہے۔

غریب خاں مطمئن ہو گیا تھا کہ اُسے کیسی قناعت پسند اور راضی برضاء رہنے والی بیوی ملی ہے۔ مگر فہمیدہ سچ مچ قناعت پسند نہ تھی۔ کیونکہ عورت اور قناعت میں ——— بڑا تضاد ہوتا ہے۔ فہمیدہ کی قناعت مجبوری کا دوسرا نام تھا۔ جس کی بدولت وہ اپنے شوہر کو بدنام کرنے پر مجبور ہو گئی تھی۔ راز صرف یہ تھا کہ فہمیدہ کے پاس پہننے کی صرف تین معمولی کم قیمت ساڑیاں تھیں۔ انہیں پہن کر وہ سہیلیوں کے گھروں اور محلّے کی تقریبوں میں اپنے شوہر کی مفلسی کا ڈنکہ پیٹنا اور اپنی ناک کٹوانا نہیں چاہتی تھی۔ اب رہیں وہ سہیلیاں جو اُس کے گھر آیا کرتی تھیں۔ وہ ان سے نہیں ڈرتی تھی۔ کیونکہ گھروں میں سبھی کی عورتیں معمولی ساڑیاں پہنتی ہیں۔

عورت کو سرسری نظر سے دیکھنے والے غریب خاں کو یہ راز معلوم نہ تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ ایک کلرک کا اپنی بیوی کیلئے تین ساڑیاں رکھنا ہی بڑی قابل تعریف بات ہے۔ وہ ایسے موقعوں پر عبداللہ کلرک کو یاد کرتا تھا جس کی بیوی نے اس سے دو کی بجائے تین ساڑیوں کی فرمائش کی تھی تو وہ اس کو میکہ چھوڑ آیا تھا۔ اور پانچ مہینوں سے عبداللہ کی بیوی اسی لیے میکہ میں پڑی ہوئی تھی۔ غریب خاں کو عبداللہ سے اپنا مقابلہ کر کے ایک روحانی مسرّت ہوتی تھی۔ کہ وہ دوسرے کلرکوں سے بدرجہا بہتر ہے۔ شادی کے تھوڑے ہی دن بعد ایک بار جب وہ فہمیدہ کو میکہ سے لیے لوٹ رہا تھا۔ تو ٹرین میں اس کی بیوی کے کپڑوں کا صندوق کھو گیا تھا جس میں شادی کی تین زرق برق ساڑیاں

بھی تھیں ـــــ فہمیدہ کو ان ساڑیوں کے کھو جانے کا بہت غم تھا۔ اگر یہ ساڑیاں ہوتیں تو غریب خاں کو بدنام کرنے کی ضرورت ہی نہ پیش آتی۔ مگر غریب خاں کو ان ساڑیوں کے کھو جانے کا مطلق افسوس نہیں تھا۔ اسی لیے جب گھر پہنچ کر اس نے فہمیدہ کو دو ساڑیاں خرید کر لا دیں۔ تو ایسا محسوس کیا جیسے یہ معمولی ساڑیاں ان زرق برق ساڑیوں سے اچھی ہیں۔ جن کو فہمیدہ کے والدین نے خریدا تھا۔ ان زرق برق ساڑیوں میں فہمیدہ اس کو کچھ اپنی اور کچھ اس کے والدین کی نظر آتی تھی۔ لیکن ان معمولی ساڑیوں میں وہ بالکلیہ "اس کی اپنی" معلوم ہوتی تھی۔

غریب خاں اپنی بیوی کی کفایت شعاری سے اتنا مطمئن تھا کہ اس نے کبھی ترقی کی خواہش نہیں کی۔ اور جب میٹریکیولیٹ کلرک اس کا مذاق اڑاتے کہ گریجویٹ ہو کر چالیس روپے پر پڑے ہو۔ تو وہ جواب دیتا کہ "میری بیوی ہندوستانی ہے ـــــ ولایتی نہیں"۔ اس کے اس جواب میں ہندوستان کے موجودہ تقلیدی تمدن پر جو چوٹ تھی۔ اس کو بعض سوٹڈ بوٹڈ کلرک برداشت نہ کر سکتے تھے۔

غریب خاں کو اپنی آٹھ سالہ ملازمت میں کوئی ترقی نہ ملی۔ لیکن اسی زمانے میں اس کے کالج کا ایک ساتھی یوسف اس کا کلکٹر بن کے آیا ـــــ یوسف کسی "اپ سٹارٹ" خاندان سے نہ تھا۔ اسی لیے کلکٹری کے طرہ کے باوجود وہ غریب خاں کا ویسا ہی دوست رہا جیسے ہوسٹل کے کمرے میں تھا۔ اس نے بھی غریب خاں کو کوئی ترقی نہ دی۔ البتہ اس کی دوستی میں

غریب خاں اپنی تنخواہ سے بھی زیادہ کمانے لگا۔ اگرچہ یہ چیز فہمیدہ کو قطعاً پسند نہ تھی کیونکہ وہ ڈرتی تھی کہ غریب خاں جیسے بھولے بھالے شخص کو پیسے کی فراوانی بہت جلد بگاڑ دے گی ـــــ آج رشوت، کل عورت اور پرسوں ـ نہ جانے کیا ـــــ!

پہلی بار جب غریب خاں کو ایک سفارش کے صلہ میں کافی رقم ہاتھ لگی تو اس نے فہمیدہ کے لیے ایک بڑی نفیس زرین بنارسی ساڑھی خریدی۔ جس کے دام بقول فہمیدہ چار بیس پر چھ تھے۔ اس ساڑھی کو دیکھ کر فہمیدہ کچھ ایسی خوش ہوئی۔ کہ غریب خاں اپنے شرمیلے پن کو بھول کر بڑی دیر تک فہمیدہ کی آنکھوں کے سُرخ ڈورے دیکھتا رہا۔

فہمیدہ اس رات بڑی دیر میں سوئی۔ کل ہی وہ تمام سہیلیوں کے گھر جانا چاہتی تھی۔ اس کے دل میں غریب خاں کے ساتھ سینما جانے کی خواہش بھی پیدا ہوئی۔ اور اُس نے اپنی خاص سہیلیوں کو اب تک اپنے من میں چھپا ہوُا راز بھی سُنا دینا چاہا کہ اب کیا ہرج ہے۔ اس سے ایک تو خود کی تعریف ہوگی۔ دوسرے اپنے پیارے شوہر کی پوزیشن صاف ہو جائے گی۔ کہ وہ عام شوہروں سے الگ ہے۔ صبح کو غریب خاں کے دفتر چلے جانے کے بعد جب اس نے وہ ساڑھی پہننے کے لیے نکالی تو معاً اس کو یاد آیا۔ کہ زمیندار کی لڑکی آصفہ کی شادی سترہ شعبان کو ہونے والی ہے۔ اس نے بڑی کشمکش کے بعد فیصلہ کیا کہ اس ساڑھی کی نمائش کا مقام زمیندار کے گھر کے سوا اور کوئی نہیں۔ اس کی سہیلیاں بلکہ خود دُلہن کی ساڑھی تک مات کھا جائے گی۔

یہ خیالات فہمیدہ کے لیے نئے بھی تھے اور بُرے بھی تھے۔ لیکن سارا قصور اس ساڑھی کا تھا۔ جب تک فہمیدہ کے پاس معمولی اور سادہ ساڑیاں تھیں وہ بھی سادہ اور معصوم تھی۔ لیکن لباس کا بھی انسان پر کتنا اثر پڑتا ہے —— فہمیدہ شعبان کی سترہ تاریخ کا کس طرح انتظار کر رہی تھی۔ اس کا حال شاید فہمیدہ بھی نہ بتا سکتی۔ البتہ وہ ہر غروب ہونے والے سورج کو بڑی پُرشوق نظروں سے دیکھا کرتی تھی۔

ایک شام ابھی غریب خاں دفتر سے نہیں آیا تھا کہ فہمیدہ کے گھر کے آگے ایک تانگہ رُکا۔ فہمیدہ متحیّر تھی۔ کہ یہ کون معزز مہمان ہے جو تانگہ پر سوار اس کے گھر آیا ہے —— ؟ اس کو اس وقت یکایک وہ بنارسی زرّین ساڑھی پہن کر استقبال کرنے کا خیال آیا۔ لیکن تانگے سے اُترتے ہوئے جب اس نے اپنی چھوٹی بہن عذرا کی صورت دیکھی تو دھک ہو کر رہ گئی۔ کیونکہ عذرا کا چہرہ جیسے برسوں کے غم سے کملا سا گیا تھا۔ اور آنکھیں بھی ڈبڈبائی ہوئی تھیں ؎

عذرا ایک سال پہلے اپنے ماموں زاد بھائی محمود سے بیاہی گئی تھی —— فہمیدہ کو شروع ہی سے یہ رشتہ ناپسند تھا۔ کیونکہ محمود ایک جاہل، بے روزگار، کاہل، نکمّا انسان ہونے کے علاوہ۔ پرائی عورتوں کا بھی دلدادہ تھا۔ اس میں خود کی کفالت کا حوصلہ نہیں تھا۔ تو وہ عذرا کو کیا پال سکتا تھا۔ بالآخر وہی ہوا۔ جو اس دیس میں ہمیشہ ہوا کرتا ہے۔ محمود جب عذرا سے تھک گیا۔ تو کہیں بھاگ گیا۔ اب عذرا کا دُنیا میں فہمیدہ کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ اسی لئے وہ پناہ ڈھونڈنے آئی تھی۔

عذرا کو اپنے گھر پناہ دے کر فہمیدہ کو ایک عجیب مسرّت ہوئی کہ اس غریبی میں بھی وہ ایک مجبور انسان کے کام تو آ گئی۔ غریب خاں بھی عذرا کا خاص خیال رکھنے لگا۔ اس کی ہر ممکن دلجوئی کرتا رہا۔ اور دن طلوع ہوتے گئے غروب ہوتے گئے۔

بالآخر سترہ شعبان آ گئی —— زمیندار کے گھر نفیریوں، ڈھول، تاشوں اور انگریزی بینڈ باجوں سے سارا محلّہ گونجنے لگا۔ فہمیدہ نے ٹرنک سے بنارسی ساڑھی نکالی۔ مگر فوراً ہی ایک سوچ میں ڈوب گئی کہ اگر وہ یہ ساڑھی پہن کر زمیندار کے گھر جائے گی تو عذرا کا دل میلا ہو جائے گا۔ فہمیدہ ایک بڑی بہن اور سمجھدار عورت ہو کر یہ کیسے گوارا کر لے لیکن فہمیدہ کے اندر جو عورت تھی۔ وہ بار بار اس ساڑھی کو پہن لینے کا مطالبہ کر رہی تھی۔ اس نے شادی سے اب تک پورے چار سال ایسی ساڑھی کبھی نہ پہنی تھی۔ ایک طرف چھوٹی بہن دُوسری طرف بنارسی ساڑھی۔ ایک طرف فہمیدہ دوسری طرف عورت۔ کبھی عورت فہمیدہ پر غالب آتی تھی۔ اور کبھی فہمیدہ عورت پر۔ اسی اثنا میں اس کی ایک سہیلی فاطمہ ایک زرّین ساڑھی جگمگاتا جمپر اور سیاہ گرگابی پہنے اندر آئی۔ اور فہمیدہ کو دیکھ کر پوچھا۔

"اری —— ابھی تک تُو تیار ہی نہیں ہوئی۔"

فہمیدہ فوراً ہی جواب نہ دے سکی۔ ابھی تک عورت اور فہمیدہ دونوں گڈمڈ ہو رہے تھے۔ مگر جب فاطمہ نے دوبارہ یہی پُوچھا تو اُس نے اپنی پریشانی کو ایک ہلکی سی مسکراہٹ میں بدل کر جواب دیا۔

"فاطمہ ـــ میں تو نہیں آسکوں گی۔ میرے سر میں بڑا شدید درد ہو رہا ہے۔ عذرا کو لے جاؤ۔ بیچاری کا دل تو بہل جائے گا"

فہمیدہ نے عذرا کو وہ بنارسی ساڑھی پہناتے وقت ایسا محسوس کیا۔ جیسے وہ دُنیا کی پہلی ایثار کرنے والی عورت اور پہلی غمگسار بہن ہے اس دل پر سے ایک بڑا بوجھ اُتر گیا تھا۔ اور اس کی رُوح کو ایک نئی مسرت حاصل تھی۔

مگر جُونہی فاطمہ اور عذرا دہلیز سے باہر چلی گئیں۔ عورت فہمیدہ پر غالب آگئی۔ اُس نے چاہا کہ دوڑ کر عذرا کو روک لے۔ اس کے جسم سے وہ ساڑھی چھین لے لیکن غریب خاں کو اندر آتا دیکھ کر وہ وہیں دالان کی سیڑھیوں پر بیٹھ گئی۔ اور مُسکراتے ہوئے اپنے سر کو دونوں ہتھیلیوں سے دبانے لگی۔ جیسے واقعی اس کے سر میں شدید درد ہو رہا تھا۔

رزّاق اور عبدالرّزاق

لوگ اسے رزّاق کہتے تھے، یعنی رزق دینے والا۔ مگر اس کے یار دوست اس کا مذاق اُڑاتے تھے۔ کہ اس کی شادی ہوئے چھ مہینے ہو گئے۔ اور اس کی بیوی صرف ایک مہینہ ہی اس کے پاس رہ کر میکہ چلی گئی۔ وہ نہ بیوی کو روک سکا تھا۔ اور نہ یار دوستوں کی زبان کو۔ وہ تو مجبور محض تھا۔ صرف نام کا رزّاق۔ وہ اپنے آپ کو کوستا "ـــــ سالے۔ اگر تیری شادی ہوئی تھی تو تو کہاں کا ایسا نواب تھا کہ پندرہ روز گھر بیٹھ رہا۔ بیوی کہیں بھاگی تو نہیں جا رہی تھی"۔ بیوی کے میکہ چلے جانے کے بعد وہ اکثر اپنے آپ کو شوہر کے بجائے سالا ہی سمجھنے لگا تھا۔

اس کی شادی پر کارخانے دار نے اس کو صرف آٹھ دن کی چھٹی دی تھی اور وہ پندرہ دن تک اپنی بیوی کے ساتھ پڑا اینڈتا رہا۔ جیسے سچ مچ کا مذاق ہے۔ سولھویں دن اس کے ہمسائے مزدور گوئندو نے جب اس کو بتایا کہ کارخانہ دار نے

اُسے نوکری سے الگ کر دیا ہے تو اُس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور ان پھٹی پھٹی آنکھوں سے وہ بڑی دیر تک گوئندو کو دیکھتا رہا۔ گوئندو چلا گیا۔ لیکن اُس کی پلکیں نہیں ہلیں۔ وہ چھت کی منڈیر سے لگے ہوئے آسمان کو دیکھتا رہا۔ پھر اس کی بیوی سامنے آئی۔ لیکن آنکھیں کھُلی رہنے کے باوجود وہ بیوی کو بھی نہ دیکھ سکا۔ بیوی نے جھنجوڑ کر اس سے پوچھا ــــ کچھ پوچھا تو وہ تیزی سے پلکیں جھپکانے لگا۔ اور ٹپ ٹپ ٹپ ــــ ٹپ ٹپ ٹپ آنسو گالوں اور بیوی کے سینے پر پھیلے ہوئے دوپٹّے پر گرنے لگے۔ روتی ہوئی آواز میں اُس نے پوچھا ــــ اب بتا کیا ہوگا؟ اس کی بیوی بھی رونے لگی یعنی اب بھی ہوگا۔

اس کی شادی بھی کیسا ناپاک خواب تھا کہ جاگنے پر ندامت اور پشیمانی کا مُنہ دیکھنا پڑا۔ اب وہ پوچھ رہا تھا کہ کیا ہوگا ــــ؟ پندرہ دن تک اس کی عقل کہاں ماری ماری پھر رہی تھی۔ اس کی چھوٹی سی گنجی کھوپڑی میں ایسا بڑا سوال چودہ دن کے مختصر عرصے میں کیسے پیدا ہو سکتا۔ اس کو تو ہمیشہ وقت پر آنکھیں کھولنے کی عادت تھی۔ صبح سویرے کارخانے کا گھُگھو پکارنے سے آدھا گھنٹہ پہلے۔ وہ نکال دیا گیا تو اُس میں نئی بات کون سی تھی۔

سب نے کہا۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ لیکن مسجد کے امام نے اپنی سپید داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے تسلّی دی۔ کہ اب بھی ہو سکتا ہے۔ اُنھوں نے آسمان کی طرف اُنگلی اُٹھا دی۔ رزّاق کی ہمّت بندھ گئی۔ اور اُس نے اس سہارے کو پکڑ لیا جو اس کے اور آسمان کے درمیان جھول رہا تھا ــــ اس نے دُعائیں مانگیں ــــ لیکن اسی شام کو وہ فوراً ہی دھم سے زمین پر آ رہا۔ جب کارخانے دار نے اپنے اُونچے مکان کی تیسری منزل

سے اس سہارے کو بھی کاٹ دیا جو رزاق اور آسمان کے درمیان لٹک رہا تھا۔
رزّاق نے کارخانے دار کے پاس سے واپس ہو کر مسجد کے چبوترے پر بیٹھ کر
سب لوگوں میں مسجد کے امام کی تھڑی تھڑی کی کہ وہ بہت جھوٹا ہے۔ اس کے بتائے ہوئے
سہارے پر آس رکھنے کے بجائے وہ کارخانے دار کی بیوی کے پیر پکڑ لیتا تو کتنا اچھا تھا۔
کارخانہ کے سارے مزدور اس کے ہرے لال نیلے پیلے دوپٹوں کو آسمان سے
زیادہ سایہ دار سمجھتے تھے۔ لیکن وہ بھی کل ہی شام چار مہینے کے لیے اپنے میکہ گئی
ہوئی تھی۔ گھر میں ہوتی تو کل ہی اس دیوی کے پیر پکڑ لیتا۔ اس سے گڑگڑا کر کہتا کہ
کہ جب آپ کی شادی ہوئی تھی تو آپ اور کارخانے دار صاحب تین مہینے کی چھٹی
لے کر کشمیر چلے گئے تھے۔

وہ تو صرف پندرہ دن تک غیر حاضر رہا۔ دیوی جانتی ہے کہ نئے نویلے دُلہا
دُلہن کے لیے پندرہ روز بھی کتنے تھوڑے ہیں۔ وہ تو شاید تین مہینوں کو بھی کم ہی
سمجھتی ـــــ مگر اس سپید داڑھی والے بڈھے نے بہکایا کہ تیرا نام عبدالرزّاق ہے۔
اپنے رزّاق پر بھروسہ کر۔ تجھے ایسی حرکت نہیں کرنی چاہئے ۔" اس نے گرج کر
کہا۔" اب بتا کہاں ہے تیرا رزّاق اور کدھر ہے رزق ـــــ " مسجد کا امام
وہاں سے بڑبڑاتا ہوا اُٹھ کر چلا گیا۔ اور رزاق اُونچی آواز میں چیخنے لگا ـــــ
"مسجد کے نام پر روٹیاں مل جاتی ہیں۔ ورنہ دیکھ لیتے کہ نماز وماز سب بھول
جاتا۔ اجی خدا کو گالیاں دے کر جُوا کھیلتا یہ ـــــ" اور رزّاق نے بڑے
زور کا ایک ٹھٹھا لگایا۔ جیسے اس نے امام کو ہرا دیا ہے۔
مگر گھر آ کے وہ خود ہار گیا۔ اس کی بیوی نے بھی وہی کہا جو امام نے کہا تھا۔

وہ تاروں بھرے آسمان کو دیکھنے لگا جو دن میں تو صرف ایک نیلے رنگ کی طویل و عریض چادر تھی اور اب ان گنت جگمگاتے تاروں سے منوّر ایک بڑا سا کالا توا، رات بھر جھوٹی تسلیاں اس کے اندھیرے دل میں جگمگاتی رہیں یونہی صبح ہو گئی۔ اور ہر طرف ایک سپید فسردگی پھیل گئی۔ وہ پھر جیت گیا۔ اور اس کو یقین ہو گیا۔ کہ ستاروں کے آگے کچھ بھی نہیں ہے۔ کچھ بھی نہیں ہے۔ اب تک وہ کیسے بڑے فریب میں مُبتلا تھا!

کارخانے کا گھگھو پکارا وہ چارپائی پر لیٹا رہا۔ آج گھگھو کی آواز کتنی ڈراونی تھی۔ شہر کی یونیورسٹی میں جب کوئی مر جاتا تھا تو ایسا ہی گھگھو تین مرتبہ پکارا کرتا تھا اور ایسی ہی ڈراؤنی آواز سارے شہر میں گونجتی تھی۔ یہ گھگھو بھی اس کے لئے اسرافیل کے صُور سے کچھ کم نہیں تھا اور بقول گوئنڈو جب تک آدمی کام کرتا ہے وہ جیتا ہے جب پاؤں توڑ کر بیٹھ رہے تو اُسے مُردہ سمجھو۔ گوئنڈو کی یہ بات یاد آتے ہی رزّاق کی آنکھوں میں پانی سا اُتر آیا۔ یہ بھی نادانستہ زندگی کے کتنے بڑے فلسفے پر عمل پیرا ہے ـــــ!

اور پندرہ دن گزر گئے مسلسل فاقوں نے ادھر رزّاق کی کمر توڑ دی۔ اور اُدھر اس کی بیوی کو بھی اس سے وحشت ہونے لگی ـــــ وہ بات بات میں جھلّانے لگی۔ اپنے ماں باپ کو کوسنے دینے لگی اور رزّاق کا معمولی سا کام کر دینے میں تو اس کے جیسے مرچیں لگتی تھیں۔ رزّاق کی صفت رزّاقیت ہی ختم ہو چکی تھی۔ یہ تو سیدھی سادی سی بات تھی۔ جیسے رزاق کی بیوی ایک عورت ہے۔

ایک دن گیارہ کوس دُور رام نگر کے گاؤں میں رزّاق کے سُسرے کو بھی

اس واقعہ کی اطلاع ہوگئی۔ وہ گالیاں بکتا ہوا بمبئی آیا اور اپنی اکلوتی بیٹی کو لے کر گالیاں بکتا ہوا واپس چلا گیا۔ رزّاق کا اس کے سسر سے بڑا جھگڑا بھی ہوا لیکن وہ نہ اپنی بیوی کو روک سکا اور نہ یار دوستوں کی زبان کو ـــــ اب اس کو بھی غصّہ آ گیا۔ اُس نے مصمم ارادہ کر لیا کہ اب وہ کبھی اپنی بیوی کو نہیں لائیگا۔ یار دوست مذاق اُڑاتے ہیں۔ اُڑایا کریں۔ ایسی سبز قدم بیوی کو لا کر اور نئی نئی آفتوں کا کہاں تک مقابلہ کرے چھ مہینے ہو گئے تھے وہ اپنے ارادے پر قائم ہی رہا۔ اب وہ اپنا رزّاق آپ ہی تھا۔ ریلوے اسٹیشن اور لاری کے اڈّوں پر حمالی کر کے دو تین آنے روز کماتا۔ شام تک اُڑا دیتا۔ اور ہر اتوار سے اس کو کوئی نہ کوئی مل ہی جاتی۔ تین چار آنے میں بھی کافی پیسے ہوتے ہیں۔

اس کے یار دوست سمجھتے یہ بھی ایک ڈھونگ ہے۔

"دھونس جماتا ہے سالا۔ ورنہ اس کی بیوی کیوں چلی جاتی۔ کون ایسی بیوی ہے جو شوہر کو مصیبتوں میں گھرا دیکھ کر اپنا دوپٹہ چھڑا کر الگ ہو جائے۔"

یہ لوگ اس کو دُکھ پہنچانے کے لیے حیات خاں پہلوان کا تذکرہ کرتے تھے کہتے تھے کہ جب پہلوان بیمار ہو کر پورے ایک سال گھر بیٹھ رہا تو پہلوان کی بیوی بیچاری خود محلّے میں سلائی کا کام کر کے اپنے شوہر اور بچّوں کا پیٹ پالتی رہی۔ اس کے ماں باپ نے لاکھ کہا کہ بچّوں سمیت ہمارے ہاں اُٹھ آؤ۔ لیکن اللہ کی بندی نے ایک بار جو "نہ" کی تو بس ہمیشہ "نہ" ہی کہتی رہی۔ اور ایک عاشق مزاج آوارہ گنوارا اس کو اور دُکھ پہنچانے کیلیے چھیڑتا۔

"یار میں تو ایسی ہی عاسک مجاج جروا سے بیاہ کروں گا۔"

یہ کچھوے رزاق کے لیے کچھ کم بھنے!

* * *

ایک دن سفید گلی کی ایک سستی سی مدراسن نے رزّاق سے فرمائش کی کہ اس کا جی مچھلی کھانے کو چاہتا ہے۔ اگر رزّاق اس کو مچھلیاں لائے تو وہ اس کے ساتھ خاص رعایت سے پیش آئے گی۔ رزّاق مچھلی پکڑنے کی چھڑی لیے ایک چھوٹے سے تالاب پر گیا اور ڈور سے ایک کینچوا لٹکا کر پانی میں چھوڑی مگر مچھلی بھی تو ایک رزق ہے اور رزق ایک مشکل پسند مرحلہ جو رزّاق کی مرضی کے بغیر حل نہیں ہوتا۔ جب طبیعت اکتانے لگی تو رزّاق نے سوچنا شروع کیا کہ وہ کب تک اس طرح مچھلیاں پکڑتا رہے گا۔ اور اب تو اس کی طبیعت بھی اکتانے لگی تھی۔ بعض مچھلیاں تو ایسی گرم ہوتی ہیں کہ بیمار ہو جانے کا ڈر ہے ــــــ اب اس کو مچھلیوں کا خیال ہی چھوڑ دینا چاہیے۔ اس خیال نے اس کے دماغ پر گہرا اثر کیا۔ اور اس نے چھڑی پانی سے کھینچ لی۔ اور اپنے آپ کو ایک واہیات سی گالی دی ــــ حرام ... ... سالے عورت کی غلامی کرتا ہے۔ وہ چلنا ہی چاہتا تھا کہ راجو ملی۔ اور ہانپتی ہوئی کہنے لگی۔

"ارے رجاک ــــ چل حیات خاں مر رہا ہے، جلدی جا ــــ"

راجو حیات خاں سے محبت کرتی تھی مدّتوں سے۔ حیات خاں تو اس کی کبھی پروا نہ کرتا تھا۔ لیکن وہ تھی کہ اس پر جان دیتی تھی۔ اب اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر اس کی گھبراہٹ دیکھ کر اس کے دل میں ایک اور کچوکا لگا ــــ ایک وہ بھی تھا جس کی بیوی اُسے چھوڑ کر چلی گئی۔ ایک حیات خاں

بھی تھا جس کے لیے دوسروں کی بیویاں تڑپ رہی تھیں۔

وہ دوڑا دوڑا حیات خاں کے گھر گیا۔ پہلوان کے صرف آخری چند سانس باقی رہ گئے تھے۔ اس کی بیوی ننھے سے بچے کو چھاتی سے چمٹائے دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔ پہلوان چند مہینوں سے ایک گندی سی ہوٹل میں نوکر تھا۔ ایک دن رات کو کام سے تھک کر اور مالک کی نظر بچا کر ہوٹل کے اوپر کھلی چھت پر سو گیا تھا کہ اس پر فالج گرا اور موت اسی بہانے کی آڑ لے کر اس پر سوار ہو گئی۔ رزّاق نے حیات خاں کے چہرے کو دیکھا۔ جو بیوی اور بچّے کی طرف دیکھ کر مسکرایا اور ننھے کو چومتے ہوئے بولا۔

"میں دُنیا میں نہیں تو کیا۔ میری نشانی تو ہے ——"

اس کے بعد اس کی آخری سانس ننھّے کے گال سے پھسلتی ہوئی فضا میں گھُل مِل گئی۔

حیات خاں کی بیوی پاگلوں کی طرح چیخ چیخ کر رو رہی تھی اور رزّاق ایسا محسوس کر رہا تھا جیسے اس کے کانوں کے پردے پھٹ رہے ہیں۔ سر پھٹ —— سر سر پھٹ —— نشانی —— سر سر پھٹ۔

اس واقعہ کے بعد سے اس کی زندگی ایک دم فسردگی میں بدل گئی۔ مچھلیاں —— نشانی —— سر سر پھٹ۔ وہ گھنٹوں ایک ہی جگہ بیٹھا رہتا۔ سوچتا رہتا —— سب کچھ سوچتا رہتا۔ بڑے سے بڑے فلسفے سمجھ لیتا۔ ایک زندگی کی کیا بساط!

"جمعرات بھری مراد" —— ایک صبح مُنہ اندھیرے ایک بوڑھی

بھکارن کی پوپلی آواز سے وہ چونک پڑا۔ اور اس دن رزاق دن بھر "مراد" کے پیچھے ہی پیچھے بھاگتا رہا۔ شام کو اسی گندی ہوٹل میں جہاں حیات خاں کام کرتا تھا۔ رزّاق کی مراد بر آئی۔ اب رزاق پھر سے رزاق ہو گیا تھا۔ بڑی تن دہی اور ایمانداری سے کام کرنے لگا۔ ایک دن ہوٹل کا ایک چھوکرا مالک سے آٹھ دن کی چھٹی مانگ رہا تھا ـــــ تو رزاق نے اس چھوکرے کو کاؤنٹر کے پیچھے لے جا کر سمجھایا کہ جب تک آدمی کام کرتا ہے وہ جیتا ہے اور جب پاؤں توڑ کر گھر بیٹھ رہے تو اس کو مُردہ سمجھو ـــــ کام زندگی ہے اور بیکاری موت۔ یہ سمجھاتے وقت رزاق پر انھوپیائی مصنّف ولیم مارس کی سی سنجیدگی طاری تھی۔

رزّاق کو جب پہلے مہینے کی تنخواہ ملی۔ بارہ روپے ـــــ تو اس روز دن بھر وہ فلمی گیت گاتا رہا ـــــ آئی بہار ـــــ بہار آج ـــــ آئی بہار وہ چاہتا تھا کہ ابھی دوڑا دوڑا جائے اور سب یار دوستوں کو بُلا لائے اُنھیں چائے کی ڈبل ڈبل پیالیاں پلائے۔ سینما دکھائے۔ حیات خاں کی بیوی اور بچّوں کی کچھ روپوں سے مدد کرے۔ سفید گلی والی مدراسن کو مچھلیاں لا کر دے ـــــ لیکن اسے بیوی یاد آ گئی اور یار دوستوں کے کچوکے۔ خصوصاً وہ کچوکا۔

"میں تو حیات خاں کی عاسک مجاج جرّوا جیسی جُردا سے بیاہ کروں گا۔"

اُس نے سوچا کہ وہ بیوی کو ضرور لائے گا۔ اس سے محبّت نہ کرے گا۔ بلکہ بات بھی نہ کرے گا ـــــ پڑی رہے گی سالی ـــــ یار دوستوں کے کچوکوں سے تو بچ جاؤں گا۔"

یہ سوچ کر اُس نے ساری تنخواہ ہوٹل کے مینجر کو لے جا کر دے دی کہ وہ اگلے مہینے کی تنخواہ کے ساتھ یہ بھی لے لیگا کیونکہ کھانا پینا تو مفت ہی مل جاتا ہے۔ رزاق کی اس بات کی ہوٹل کے تمام چھوکروں میں دھوم ہو گئی۔ وہ اسے چھیڑنے لگے۔

"سالے کو کسی سے عشق ہے"۔

"بنارسی ساڑھی خریدنے والا ہے اس کے لیے"۔

رزّاق کے محلّے میں رہنے والے ہوٹل کے باورچی نے اُسے چھیڑا۔

"ارے— وہ بھی بھاگ جائے گی۔ کیوں روپیہ جمع کرتا ہے—"

"کھا پی کر مزے اُڑا —— چل آج "بندھن" دیکھیں گے۔ لیلا چٹنس ہے یار اس میں —— اہا لیلا چٹنس یار اگر میں باورچی نہ ہوتا— !"

سب ہنس پڑے اور باورچی کو ستانے لگے۔ بات آئی گئی ہو گئی لیکن رزاق کو اس وقت تک سکون نہیں ہُوا۔ جب تک اس نے باورچی کو دو پیالی چائے اور سگریٹ کی ایک ڈبیا پلا کر اس راز کو نئے لونڈوں کے سامنے نہ کہنے کی تاکید نہ کر دی۔

اگلے مہینے تک رزّاق کی رزاقیت میں کافی استحکام پیدا ہو گیا۔ اور جس دن اس کو اگلے مہینے کی تنخواہ ملی۔ اس نے مالک سے چار روز کی چھٹی مانگی کہ وہ اپنی بیوی کو میکے سے لانے جا رہا ہے۔ اسی دن شام کو اُس نے سارے دوستوں کو ہوٹل میں چائے پلائی۔ پان کھلائے اور

پاسنگ شو سگریٹ کی ڈبیا کا مُنہ کھول دیا۔ پھر سب یار دوستوں کے ساتھ اسٹیشن گیا۔

آج اُس نے سر پر سپید شملہ باندھ رکھا تھا۔ سلک کی قمیض تھی اور مالک کی پُرانی شلوار اور اُس کا دیا ہُوا پمپ شُوز پہن لیا تھا۔ جب ٹرین میں بیٹھ گیا تو ایک عجیب سی خوشی سے وارفتہ ہونے لگا۔

—— پیا مِلن کو جانا۔ ہاں ہاں پیا مِلن کو جانا —— جانا پیا مِلن کو۔ جانا ۔۔"

⁂ ⁂ ⁂

وہ اپنی بیوی کو پھر بمبئی لے آیا۔ رات کو بستر پر لیٹنے سے پہلے اُس نے اپنی بیوی کی کمر میں گدگدی کرتے ہوئے پوچھا

"تجھے مجھ سے محبّت ہے —— ؟"

بیوی نے شرم سے گھٹی ہوئی سانس میں جواب دیا۔

"دل و جان سے ——"

دفعتاً اُس نے بیوی کا ہاتھ چھوڑ کر کہا۔

"مسجد کا امام بھی خدا سے بہت محبّت کرتا ہے ۔"

اُس کی بیوی حیرت سے اس کا مُنہ تکنے لگی کہ میاں بیوی کی باتوں میں مسجد کے امام کا ذکر کیوں آگیا ؟

اشرف المخلوقات

ایک دن میں نے اپنے ایک دوست سے پوچھا کہ دُنیا میں سب سے زیادہ حسین چیز کونسی ہے۔ اُس نے جواب دیا کہ وہ ایک خوبصورت لڑکی ہے جسے اُس نے اکثر مال روڈ پر سائیکل پر آتے جاتے دیکھا ہے۔ مجھے اس کی سادہ لوحی پر بے ساختہ ہنسی آگئی اور میں نے ہاتھ میں جگمگاتے ہوئے چاندی کے ایک سکّے کو دکھاتے ہوئے پوچھا۔ کیا وہ لڑکی اس دمکتے ہوئے سکّے سے زیادہ خوبصورت ہے؟ کیا اس کے حُسن میں ایسی ہی تابناکی ہے؟ وہ غصّے سے بھر گیا اور چیخ پڑا "تم جانور ہو۔ جذبات سے عاری انسان ہو"۔

سچ مچ میں جانور ہوں۔ جذبات سے عاری انسان ہوں۔ میں نے بھی اُس مال روڈ کی حسینہ کو بار بار دیکھا ہے مگر نہ تو کبھی میرے دل کی دھڑکنوں میں کوئی اضافہ ہوا اور نہ میں نے کبھی ایسا محسوس کیا کہ میں نے کوئی چیز کھو دی ہے۔

مجھ جیسے نوجوان لڑکے کو دیوانہ بنانے کے لیے اس لڑکی میں کتنی ہی رعنائیاں تھیں۔ کتنی ہی لطافتیں تھیں۔ کتنی ہی نزاکتیں تھیں مگر میرا خون سفید ہے چاندی کے ایک سکے" کی طرح سفید۔ اس کی آنکھوں میں ستارے جگمگاتے ہیں۔ اور میری زندگی ایک اندھیری رات ہے۔ ستارے آپ ہی آپ جگمگا سکتے ہیں۔ مگر رات کے اندھیرے کو دُور نہیں کر سکتے۔ اس کے پتلے پتلے ہونٹوں میں گلاب کی پتیاں تھرکتی ہیں مگر گلاب کی پتیاں میرے بھوکے پیٹ کی غذا نہیں۔

دُنیا میں ہمیشہ سے مہنگی چیز گرانقدر سمجھی جاتی ہے۔ سستی چیزیں کم قدر، کم مایہ اور کم حقیقت۔ اس دَور میں اور اس دیس میں چاندی کا ایک چمکدار سکہ" مہنگا اور گرانقدر ہے۔ اور ایک خوبصورت لڑکی کم قدر۔ کم مایہ اور کم حقیقت اگر کبھی کوئی مجھ سے کہے کہ میں تمہیں سو روپے دوں گا اور تم اس مال روڈ کی حسینہ کو قتل کر دو تو میں تیار ہوں۔ میں بیدریغ اس کو قتل کر دوں گا۔ مجھے حُسن سے زیادہ پیٹ کی پرواہے حُسن رُوح کی غذا ہے۔ مگر روپیہ پیٹ کی۔ پیٹ کے لیے تو سب کچھ کیا جا سکتا ہے اور خوبصورت لڑکیاں تو ٹکے ٹکے ہیں۔ "ٹبّی" بازار جاؤ۔ وہاں خوبصورتی کی قیمت صرف ایک روپیہ ہے۔

کچھ دنوں بعد میں نے سُنا کہ اس مال روڈ کی حسینہ کی شادی اسی کلرک دوست سے ہو گئی ہے جو اس پر بُری طرح مرتا تھا۔ یہ کلرک دوست کالج کی زندگی سے میرا دوست تھا۔ ایک دُبلا پتلا مریل انسان عملی زندگی میں قدم رکھنے سے قبل ہی کتابوں نے اُسے چاٹ لیا تھا۔ یہ لارڈ مکالے کا احسانِ عظیم ہے۔ کہ جس طرح دیمک کتابوں کو چاٹ جاتی ہے۔ اسی طرح کتابیں ہندوستانیوں

کو چاٹ رہی ہیں۔ میرا کلرک دوست بھی انہی میں سے ایک ہے۔ میں نے اس کو اس کی شادی پر مبارکباد دی کہ دوست شکریہ ادا کرو کہ تمھیں ایسی خوبصورت بیوی ملی۔ اور فوراً ہی میں نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک ہلکی اور پھیکی سی مسکراہٹ تھی۔

وہ جذبۂ تشکر کی نشانی تھی یا قدرت سے شکوہ — ؟

اس نے مجھے دوسرے دن کے لیے چائے پر مدعو کیا اور رخصت ہوا۔ اس کے چلے جانے کے بعد میں دیر تک سوچتا رہا۔ کیا خوبصورتی اور بدصورتی میں کبھی نباہ بھی ہو سکتا ہے۔ کیا اس بدصورت انسان میں حسن کی قیمت ادا کرنے کی واقعی ہمت ہے اور اگر ایسا ہے تو پھر یہ ہلکی اور پھیکی مسکراہٹ کیسی۔

دوسرے دن چار بجے میں اس کے گھر پہنچا۔ بدصورت آدمی نفاست کا بڑا خیال رکھتے ہیں۔ وہ اس خلا کو جو ان کی شخصی بدصورتی سے پیدا ہوتا ہے۔ پُر کرنے کی ہمیشہ کوشش کرتے ہیں تاکہ ترازو کے پلڑے برابر برابر رہیں چنانچہ میرے دوست نے ایک نفیس سُوٹ پہن رکھا تھا۔ چہرے پر کریم کی مصنوعی چمک تھی۔ مگر آنکھوں کی بے نوری۔ جھریاں اور ہڈیاں۔ دُودھ کا دُودھ، پانی کا پانی۔ اس کے باوجود میرا دوست میری آنکھوں میں جچ رہا تھا۔ ایک صاف ستھری میز پر چائے کا سامان قرینے سے رکھا ہوا تھا۔ چائے دانی سے نکلتی ہوئی بیقرار بھاپ کی طرح میرا دل بیچین تھا کہ اس گلبدن کو اب دیکھوں کہ کس حال میں ہے — اسی اثنا میں سامنے والے دروازے کا نیلا پردہ ہٹا اور میں نے محسوس کیا جیسے ناٹک دیکھ رہا ہوں میں نے پہلے بھی گلاب کی پتیوں کی رونق دیکھی ہے، پہلے بھی آنکھوں

کے ستارے جگمگاتے دیکھے ہیں۔ مگر اب ستارے جھلملا رہے ہیں، جیسے صبح ہونے کو ہے۔ اب پتیاں زرد ہو رہی ہیں جیسے خزاں آنے کو ہے۔

"دوست یہ تمھاری بھابی ہیں۔"

"اوہ — مجھے آپ سے ملنے کا بڑا اشتیاق تھا۔"

ہم تینوں کے ہونٹوں پر ہلکی اور پھیکی مسکراہٹیں تھیں۔ میں نے کہا۔

"دوست — تمھاری زندگی پر مجھے رشک آتا ہے۔ تم تو فردوسی زندگی بسر کرتے ہو۔ ایک خوبصورت بیوی کا وجود تو گھر کو جنت بنا دیتا ہے۔"

"مگر بھائی! میں ایک کلرک ہوں۔ صبح سے شام تک دفتر میں دفن رہنا۔ پھر آدھی رات تک گھر پر دفتر کا کام کرنا۔ اور اس کے بعد ایک تھکے ہارے انسان میں کیا رہ جاتا ہے۔ نیند تھکن دُور کر سکتی ہے یہ خوبصورتی —"

میں نے اس کی خوبصورت بیوی کی طرف دیکھا۔ اس کی لانبی پلکیں زمین کی طرف جھکی ہوئی تھیں۔ شاید اس کی آنکھوں کے کنارے بھیگے ہوئے بھی تھے۔ میری بھی نگاہیں زمین میں گڑ گئیں۔ اور اب تو ہر چیز زمین میں گڑ گئی ہے خوبصورت پلکیں، حسن کی مداح نگاہیں اور سطح پر کیا رہ گیا ہے — چاندی سونا — اور جانور — اور جذبات سے عاری انسان۔

پُرانے زمانے میں ایک بادشاہ بڑا حسن پرست تھا۔ ایک مرتبہ خواب میں اُس نے ایک حسین و جمیل دوشیزہ دیکھی اور فوراً اس پر عاشق ہو گیا۔ صبح اُٹھنے کے بعد اس نے اسی خط و خال کی ایک تصویر بنوائی اور دُنیا میں ایسی شکل و صورت کی دوشیزہ کی تلاش میں ہر طرف آدمی دوڑائے اور ایسی دوشیزہ کے لیے وہ اپنی ساری سلطنت

اور اپنے پورے جاہ و حشم کو لٹانے کے لیے تیار تھا —— مگر اب پہلو میں ایک حسین بیوی ہے اور دل تمنا سے خالی ہے۔ حُسن داد چاہتا ہے۔ مگر دفتر کو دیر ہو رہی ہے۔ رات آرام کے لیے بنائی گئی ہے مگر مسودے صاف کرنا باقی ہیں اور بیوی کی تعریف سے ایک شرمیلی مسکراہٹ کے سوا کچھ نہیں حاصل ہو سکتا۔ مگر صاحب کی تعریف سے تنخواہ میں اضافہ ہونے کا امکان ہے —— اور اس امکان میں کتنی خوشی پنہاں ہے —— کتنا سرور مضمر ہے۔ کتنا لطف پوشیدہ ہے۔

بہت دنوں بعد ایک بار پھر میں اپنے اس کلرک دوست سے ملنے گیا۔ وہ خلاف عادت بڑا ہشاش بشاش نظر آ رہا تھا۔ اس نے دیکھتے ہی مجھے گلے لگا لیا اور فرطِ مسرت سے کہنے لگا۔ دوست اب میری تنخواہ ایک سو چالیس روپیہ ہے۔ میری بیوی اب بڑے صاحب کی سکریٹری بنا دی گئی ہے۔ وہ ٹائپ اور شارٹ ہینڈ جانتی ہے نا۔ اس کی تنخواہ اسّی روپیہ ہے اور میری تنخواہ ساٹھ روپیہ۔ اب ہم امیر ہو گئے ہیں۔ ایک سو چالیس روپے کمانے والے۔

میں نے اس کو مبارک باد دی اور پوچھا۔

"اچھا۔ بھابی کہاں ہیں —— لاؤ انھیں بھی مبارک باد دوں۔"

"ارے وہ تو صاحب کے ساتھ تین روز سے دورے پر گئی ہوئی ہے۔"

میرے دل پر جیسے کسی نے زور سے گھونسا لگایا۔ یہ کیسا عجیب انسان ہے۔ اس میں وہ انسانی جوہر کہاں ہے جسے خودی کہتے ہیں۔ اس نے کیسے یہ سب گوارا کر لیا۔ مجھے بے انتہا حیرت تھی۔ وہ کلرک سے ہیڈ کلرک ہو گیا۔ کیا میں اسے

انسان کہہ سکتا ہوں۔ وہ آنکھیں رکھتا ہے مگر کیا میں اُسے آنکھ والا کہہ سکتا ہوں۔ اگر کوئی مجھے سوسائٹی کے قوانین سے بچائے تو میں اس کو گولی مار دوں۔ وہ مشرق کی عورت ہے باغ کا پھول نہیں۔ وہ گھر کی رونق بن سکتی ہے۔ دَور و کی نہیں۔ اپنا تمدن ہمیں کیا سکھاتا ہے۔ مگر مداری ڈگڈگی بجا رہا ہے اور ہم ناچ رہے ہیں، اندھا دھند میرا دوست گا رہا ہے "ساون کے نظارے ہیں آہا آہا ۔۔۔" سچ ہے اندھے کو اندھیرے میں بڑی دُور کی سوجھتی ہے۔ میں وہاں سے اُٹھ کر چلا گیا۔ اور میں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ اس منحوس کی صورت کبھی نہ دیکھوں گا۔ کیونکہ اب وہ انسان نہیں رہا تھا۔

مدّت گزر گئی اور میں اپنے ارادے پر قائم رہا۔ مگر ایک دن میں نے سُنا کہ میرا وہ دوست نوکری سے نکال دیا گیا۔ اور اُس نے انتقاماً اپنی بیوی کو گھر سے نکال دیا۔ وجہ یہ تھی کہ وہ لڑکی بڑے صاحب کے ساتھ بدنام ہو گئی تھی۔ وہ ٹائپ اور شارٹ ہینڈ تو جانتی تھی مگر مرد کی فطرت نہیں پہچانتی تھی ۔۔۔ اور پھر چاندی کے سکّے تھے۔ اس سانحہ کا میرے دل پر بڑا اثر ہُوا ۔۔۔ میں نے سوچا کہ میں اس لڑکی کی قدر کر سکتا ہوں۔ میرے پاس چاندی ہے نہ سونا ۔۔۔ صرف دُکھ۔ تو دکھ جاننے والا ایک گوشت کا لوتھڑا پہلو میں ہے۔ ایسے ایسے دلآویز خیالات سے میں اُچھل پڑا اور اس لڑکی سے ملنے کے لیے روانہ ہو گیا۔

گھوڑا ہسپتال کے پاس ایک تنگ سی گلی میں اس نے ایک چھوٹا سا مکان کرایہ پر لے رکھا تھا۔ جب میں اُسکے کمرے میں داخل ہُوا وہ ایک لکڑی کی

کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی مرمریں ٹھوڑی اس کی ہتھیلی پر دھری تھی۔ وہ بڑی بڑی آنکھوں سے سامنے ہی سامنے دیکھ رہی تھی۔ اُس نے اپنی لانبی لانبی پلکیں اُٹھا کر میری طرف دیکھا۔ اور پھر خاموشی سے سامنے آنکھیں پھاڑے دیکھنے لگی۔ دُنیا بھر کا درد اور غم سمٹ کر اس کی آنکھوں میں سما گیا تھا۔ میرا دل اندر ہی اندر ڈوبا جا رہا تھا۔ کرسی کے سامنے ایک چھوٹے سے سٹول پر کاغذات کا ایک پلندہ رکھا تھا۔

میں نے اپنی حالت کو سنبھالتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

"خاتون ـــــ مجھے آپ کی حالت دیکھ کر بڑا دُکھ ہوتا ہے۔ میرا دوست جانور ہے۔ وہ آپ کی قدر نہ کر سکا ـــــ مگر میں آپ کی ہر ممکن مدد کے لیے تیار ہوں۔ آپ مجھے اپنا دوست سمجھیں ـــــ دُنیا میں سب مرد ایک طرح کے نہیں ہوتے" اس بات کا اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اور سامنے پڑے ہوئے کاغذات کی طرف اشارہ کیا۔ میں ایک ایک چٹھی اُٹھا کر پڑھنے لگا۔ سب کا یہی مطلب تھا۔ میں آپ کی ہر ممکن مدد کرنے کے لیے تیار ہوں۔ دس روپیہ۔ پندرہ روپیہ۔ پچاس روپیہ، اور بدنامی کا بھی کوئی ڈر نہیں ـــــــــــ

مجھ پر سکتہ سا طاری ہو گیا۔

انسان اشرف المخلوقات ہے!

صراطِ مُستقیم

نسلاً غلام ہو کر حکومت کرنے کی رسم قطب الدین ایبک کے زمانے سے چلی آ رہی ہے۔ اس میں کلکٹر صاحب کا کیا قصور۔ قصور تو میرا ہے کہ میں انسان ہوتے ہوئے بھی انسان نہیں ہوں بلکہ صرف ایک کلرک ... قصور ان والدین کا ہے جنہوں نے چالیس سکوں کی جگمگاہٹ دیکھ کر اپنی کنواری خوبرو لڑکی مجھ سے منسوب کر دی تھی۔ میری شادی کی تاریخ کوئی چار مرتبہ مقرر کی گئی۔ اور چاروں مرتبہ دولھا ایک مریل گھوڑے پر سوار دیہاتوں میں لگان وصول کرتا پھرتا رہا ـــــ اور پیاری دولہن کے میٹھے میٹھے خواب ہر دفعہ ٹوٹ پھوٹ گئے۔ میرے کانوں میں کلکٹر صاحب کا یہ جملہ صدائے بازگشت کی طرح گونجتا ہی رہا کہ اگر شادی کا ایسا ہی شوق ہے تو نوکری کیوں کرتے ہو؟ ... ... کیوں کرتے ہو؟ بھلا شادی بھی کوئی شوق کی چیز ہے!

اب مجھے احساس ہے کہ نوکر ہونے کے بعد گویا میں اپنی جنس سے بھی ہاتھ دھو بیٹھا ہوں۔ عورت سے بھی زیادہ مجبور ہوں۔ اپنی دلہن سے بھی زیادہ بے زبان ہوں۔

میری غم سے پھٹی پھٹی آنکھیں اور افسردگی سے لٹکتے ہوئے چہرے کو دیکھ کر گرگ باراں دیدہ کلرک چھوٹو رام نے صلاح دی۔

"بھیّا —— قصور تمھارا ہی ہے۔ اب موقع ہے صاحب سے جا کے معافی چاہ لو۔"

معافی —— میں نے چھوٹو رام کے چہرے پر پھیلی ہوئی گہری گہری جھرّیوں کو دیکھا اور ایسا محسوس کرنے لگا جیسے اس کی ایک ایک جھرّی ایک ایک معافی کی نشانی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ وہ ساری کچہری میں ایک ہی دیانت دار کلرک سمجھا جاتا ہے جس کا ریکارڈ اس کے گنجے سر کی طرح صاف ہے۔ میں نے ذرا گرم ہو کر جواب دیا۔

"چھوٹو رام۔ میرا قصور ہی کیا ہے۔ صاحب نے بیچارے رام لال کو بلا قصور نوکری سے الگ کر دیا۔ اس کے دس ننھے ننھے بچّے اور بیوی روٹی روٹی کو ترسنے لگے۔ اگر میں نے ایک مظلوم انسان کی حمایت میں اخباروں کی مدد لی۔ تو کیا بُرا کیا میں نے۔ سانچ کو جب آنچ نہیں تو پھر ڈر کیا۔ یہ کیسے لوگ ہیں جن کے کوئی گریبان ہی نہیں۔ یہ کیا ستم ہے کہ انسان ہو کر بھی انسان کو جینے نہیں دیتے۔"

چھوٹو رام نے نسوار چڑھاتے ہوئے بڑی متانت سے کہا۔

"مگر بھیّا۔ کوئلے کی دلّالی میں کیوں ہاتھ کالے کرتے ہو۔ یہ تو ہوتا ہی رہتا ہے۔

اب تک یہی ہوتا رہا ہے اور آئندہ یہی ہوتا رہے گا۔ساچ کو آنچ تو اُسی دن لگ گئی جس دن انسان نے پیسہ ایجاد کیا۔اور تمہارے سچ بولنے سے رام لال اور اس کی بیوی بچوں کے پیٹ بھر تو نہیں گئے۔مفلسی میں سچائی مسخراپن نہیں تو اور کیا ہے۔یہ جانتے ہوئے بھی تم خواہ مخواہ اُلجھ رہے تھے۔اُلجھنے سے کوئی چیز سُلجھی ہے۔اگر تم صاحب سے نہ اُلجھتے تو تمہارے اندھیرے گھر میں وہ شمع رُو منگیتر ۔۔ کیا نام ہے اس کا ــــ ؟

میں نے چھوٹو رام کو کوئی جواب نہیں دیا۔کیونکہ شمع رُو کے لفظ سے گویا میرے خیالوں پر بہت سے چمکدار لمبے لمبے گیسو چھا گئے۔ایک موہنی سی صورت شرما شرما کر میری آنکھوں میں پھر گئی۔میرا سارا جسم آگ کی طرح پُھنکنے لگا۔اندر ہی اندر سے کوئی چیخ چیخ کر پوچھنے لگا۔

"رام لال تیرا کون ہوتا تھا ــــ بتا رام لال سے تیرا کیا رشتہ تھا۔دیوتاؤں نے جب انسان سے مُنہ موڑ لیا تو تُو کہاں سے انسان کا غم کھانے لگا اور، اور تُو انسان ہی کب ہے تُو تو کوٹلے کا دلّال ہے ۔۔ ۔۔ کوٹلے کا دلّال ۔۔ ۔۔"

اللہ اللہ ــــ یہ کیسا بورژوالی طلسم ہے کہ میرا ضمیر بھی اب میرے خلاف ہے۔مگر فلسفۂ خودی اور انا پر اتنی بہت سی کتابیں پڑھ کر بے وجہ معافی چاہ لینا میری کتنی بڑی ہتک ہے۔انسان بڑا ہی حسّاس جانور ہوتا ہے۔وہ تو ہتک کو موت پر ترجیح دیتا ہے۔اسی لیے میں نے چھوٹو رام کو مخاطب کر کے کہا۔

"چھوٹو رام میں معافی تو نہ چاہوں گا۔ہاں البتّہ نوکری چھوڑ دوں گا۔"

چھوٹو رام مسکرایا ــــ ایک کڑوی سی ہنسی ...... اور پھر بولا۔
"نوکری چھوڑ دو گے ــــ بہت اچھے۔ شاباش۔ مگر کیا تم سمجھتے ہو کہ نوکری چھوڑ دینے سے تمہاری شادی ہو جائے گی۔ تمہاری منگیتر کسی دوسرے چالیس روپے کمانے والے کے سپرد کر دی جائے گی ــــ کیا سمجھے؟

یہ کڑوا جواب سن کر ایک مُبہم خوف کے زیر اثر میرے سارے جسم میں ایک تھرتھری سی دوڑ گئی۔ میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چھوٹو رام کو دیکھنے لگا کتنی کڑوی باتیں سُناتا ہے یہ چھوٹو رام کیسی کڑوی زبان ہے اس کی۔ یہ چھوٹو رام نہ گریجویٹ ہے اور نہ نیٹشے، رومی اور اقبال کو جانتا ہے بس ایک ایسا انسان ہے جس کے چہرے کی جھریوں نے زندگی کے سارے گُر معلوم کر لیے ہیں اور ایک میں ہوں اور میرا نام کالج کا نیم بریاں دماغ۔ کیسی تلخ بات ہے۔ یہ کہ اگر میں نوکری چھوڑ دوں تو میری منگیتر دوسرے چالیس روپے کمانے والے کے حوالے کر دی جائے گی۔ مگر ایسا نہ ہو گا ــــ کبھی ایسا نہ ہو گا۔ میری منگیتر فہمیدہ میری بچپنے سے پروان چڑھتی ہوئی ایک پیاری آرزو ہے۔ یہ آرزو اگر پیاسی رہ جائے تو ڈوبنے والے کو تنکے کا ایک سہارا بھی نہ رہے ــــ میں نے تو کئی بار ریلوے لائن پر لیٹنے کا ارادہ کر لیا تھا اور یونیورسٹی کانووکیشن میں جب میں نے اپنی بی۔ اے کی ڈگری لی تھی تو یونیورسٹی ڈاکٹر سے کہا تھا کہ ڈاکٹر اس ڈگری کے عوض مجھے زہر کی ایک شیشی دے دو۔ وہ ڈاکٹر ایک بے ہنگم قہقہے کے ساتھ کرسی سے اُچھل پڑا تھا۔ حالانکہ میں اس وقت بالکل سنجیدہ تھا۔ میرے خاندان کے پالنے والے مجھ سے مُنہ موڑ چکے تھے۔ میرا

باپ مر چکا تھا اور صرف میرا چچا یعنی فہمیدہ کا باپ میرا ہمدرد تھا۔ کیونکہ فہمیدہ جوان ہو کر ایک بھاری چٹان کی طرح اس کے سینے پر چڑھ گئی تھی۔ اس کو اُمید تھی کہ میں گریجویٹ ہو کر کوئی بڑا نوکر بن جاؤں گا۔ اور مجھے اُمید تھی کہ میرا پُرانا خواب ایک جگمگاتی تعبیر سے روشن ہو جائے گا۔

امید کتنی موہوم سی بنیاد ہے زندگی کی۔ میں نے اس اُمید پر چالیس روپیہ کی نوکری قبول کر لی تھی مگر فہمیدہ کے باپ سے بہت ڈرتا تھا کیونکہ وہ ایک سوداگر تھا۔ اس کی مختصر سی دُکان میں اُونچی ایڑی والی گرگابی سے لے کر فہمیدہ تک ہر چیز کی ایک قیمت متعین تھی۔

اچانک ہال میں ایک گھبراہٹ سی پھیل گئی۔ چھوٹو رام۔ سعادت حسن۔ پرکاش چند سب کے سب کھڑے ہو گئے۔ کلکٹر صاحب کچہری آ گئے تھے۔ ہم کلرکوں کا ہال کلکٹر صاحب کے آفس کا راستہ بھی تھا۔ مجھے ویسے ہی کُرسی پر بیٹھے دیکھ کر اُنھوں نے تیوریاں چڑھائیں اور پوچھا۔

وقت گزارنے آتے ہو کچہری تم ـــــ!

میں گھبرا کر کھڑا ہو گیا جی میں تو آیا کہ پُوچھ لوں کہ یہاں کون وقت گزارنے آتا ہے۔ ہم صبح کے آٹھ بجے سے یہاں بیٹھے ہیں۔ اور تم بارہ بجے آتے ہو۔ تم بارہ بجے آتے ہو۔ تم چھ سو روپے کماتے ہو اور ہم چالیس روپلے ـــــ میں پوچھنا تو بہت چاہتا ہوں۔ مگر وہی بورژوائی طلسم جس نے میرے دماغ ۔ ضمیر۔ دل۔ زبان سب کچھ مسحور کر رکھا ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ فہمیدہ کا دہ تاباں چہرہ۔ کتنا کمزور ہو کر رہ گیا ہوں میں!

صاحب کے چلے جانے کے بعد سعادت حسن نے میرے ٹیبل کے قریب اپنی کرسی کھینچ لی اور کہا۔

"لا ــــ ایک سگرٹ پلا۔"

میں نے سگریٹ اور ماچس سعادت حسن کی طرف بڑھا دی۔ سعادت حسن سگریٹ اور عورت کا بڑا دلدادہ ہے۔ اس کا نقطۂ نظر ہے کہ سگریٹ اور عورت دونوں وہ ارزاں ترین عیاشیاں ہیں جن میں پرتگالی شراب کے نشے سے زیادہ واقعیت ہوتی ہے۔ سگریٹ جلا کر اس نے بجھی ہوئی دیا سلائی میرے چہرے پر پھینک کر کہا۔

"یہ کیا صورت لٹکائے بیٹھا ہے۔ بڑا فلسفی بنا پھرتا ہے۔ آخر تجھے فہمیدہ میں کونسی لیلیٰ دکھائی دیتی ہے کہ مجنوں ہوا جا رہا ہے دن بدن۔ آج شام چل میرے ساتھ تجھے ایسی ایسی پریاں نہ دکھاؤں کہ فہمیدہ تو فہمیدہ تو اپنے آپ کو بھی بھول جائے۔

میں نے اپنی بھنویں سکیڑ لیں۔ جیسے سعادت حسن کی بدنفسی کا یہی ایک جواب ہے۔ سعادت حسن کی عادت ہے کہ کوئی مانے یا نہ مانے۔ وہ ہر کسی کے آگے اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے۔ جیسے ساری دنیا میں وہی ایک راست باز ہے جس کی زندگی کا راستہ سیدھا ہی سیدھا چلا گیا ہے۔ اس نے سرگوشیانہ انداز میں کہنا شروع کیا۔

سنا ہے تو نے کچھ۔ آج کل شہر میں ایک نئی آئی ہوئی ہے۔ دنیا کی تمام عورتوں سے انوکھی۔ نام بھی چٹپٹا۔ الائچی جان۔ کیا گاتی ہے ظالم۔ آواز ہے کہ رس

اور مٹھاس کی سلسبیل۔ جب وہ گاتی ہے "گرگئی رے مورے ماتھے کی بندیا" تو کس کا دل اس بندیا کو سب سے پہلے ڈھونڈ نکالنے کے لیے بیقرار نہیں ہو جاتا کیا کہوں دوست وہ کیسی ہے۔ ارے بس سمجھ لو۔ جان پر یاں کی بوتل میں بھی کیا نشہ ہو گا جو اس میں ہے۔ بول کیا ارادہ ہے۔"

میں نے سعادت حسن کو چُپ کرانے کی کوشش میں جواب دیا۔

"مگر بھیّا۔ میں تو ایک باعزت زندگی کا قائل ہوں۔"

سعادت حسن نے مُنہ کھول کر مکارانہ نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"باعزت زندگی! — ہونہہ یہ بھی ٹھیک ہے۔ مگر چالیس روپیہ کما کر بھی باعزّت زندگی کا سودا دماغ میں ہے —؟ کبھی رام لال کے گھر گیا ہے تُو —؟ دیکھی ہے تُو نے اس کی حالت چالیس روپے میں۔ ایک بیوی دس بچّے اور خود۔ اب نوکری سے الگ ہُوا۔ آج کل لاپتہ ہے۔ اب ایک دم گیارہ زندگیوں کے لالے پڑ گئے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ رام لال کے گھر جب بھی کوئی بچہ پیدا ہوتا وہ ہمیں مٹھائی کھلاتا اور بڑی ڈینگیں مارتا کہ بھگوان کی مخلوق میں اضافہ کرنا اصلی اور سچّی عبادت ہے۔ میں نے سعادت حسن کو مرعوب کرنے کے لیے کہا۔

بالکل ٹھیک کہتا تھا رام لال —! سعادت نے آنکھوں میں طنز کی ایک جھلک سی پیدا کی۔

ہاں — اور تم بھی ٹھیک کہتے ہو۔ اب جو یہ بھگوان کی مخلوق بھوک اور بیماری سے مر رہی ہے کہاں مُنہ چھپا رہا ہے وہ سچائی کا پجاری؟ ابے میاں

ہوش کی دوا خریدو۔ چالیس روپیہ کمانے والے کے لیے شادی ایک حماقت ہے۔ ایک صریح بیوقوفی، اب مجھ ہی کو دیکھو۔ اگر نوکری سے الگ بھی ہو جاؤں تو اتنا پیسہ ہے کہ ساری عمر الائچی جان کے کوٹھے پر گزار دوں۔"

میں پوچھنا تو نہیں چاہتا تھا مگر جانے کیا بات ہوئی میرے مُنہ سے یہ جملہ نکل گیا۔" اور بقائے نسل؟"

سعادت حسن ایک غصیلے انسان کی طرح میز پر کہنیاں ٹیک کر میری طرف جُھک کر پوچھنے لگا۔

"کونسی نسل ——؟ یہ انسانی نسل؟ اس کے بقاء کی ذمہ داری اب کس پر ہے۔ وہ خود بخود زوال کی طرف جا رہی ہے جو انسان بچّے پیدا کرتا ہے وہ کالج کی عمارتیں بھی بناتا ہے جو رفاہی کام کرتا ہے وہ ہتھیار بھی بناتا ہے۔ جو نسل پھیلانا چاہتا ہے وہی نسل کا استیصال کرتا ہے۔ رام لال نے دس بچّے پیدا کیے اور اب دس بچّوں کی مَوت کا بھی وہی ذمّہ دار ہے۔ یہ جنگیں، لڑائیاں، دولت کی غلط تقسیم، بھُوک بیماری، کیا انہی بجلیوں کے لیے آشیانے بنائے جائیں۔ تیری فہمیدہ آج ایک نرم اور کومل لڑکی ہے۔ کل وہ مشین بن جائے گی اور ایک دن تو بھی رام لال کی طرح کہیں بھاگ جائے گا۔"

"سعادت خاموش رہو۔ فہمیدہ کا ذکر نہ کرو۔ میرا دل گھبراتا ہے۔"

سعادت حسن مسکراتے ہوئے نرم نرم لہجے میں مجھے سمجھانے لگا۔

"ہاں تو بھیّا —— میں بھی تو اسی دل کی گھبراہٹ کا علاج بتا رہا ہوں۔ فہمیدہ کا خیال چھوڑ —— آسکر وائیلڈ سے رجوع کرو۔ جوانی میں گناہ کرو۔

جوانی کو دوام حاصل ہو جائے گا۔ یہ صحیح ہے کہ باعزت زندگی اور ایک باعصمت بیوی کی بدولت زندگی نمونہ فردوس بن جاتی ہے۔ کیا تم نے کبھی غور کیا ہے کہ ایسی نسل بڑھانے سے کیا فائدہ جو بالکلیہ دُنیا کے بڑے بڑے انسانوں کے رحم و کرم پر ہو۔ ہماری اولاد بھوک بجھانے کے لیے بنئے کی، رہنے سہنے کے لیے سیٹھ کی، بیماری کے لیے ولایتی دوائیوں کی، زندگی کے لیے فوجی بھرتی کی محتاج ہو۔ کیا اسی لیے نسل بڑھائی جائے۔ رام لال کے بچّے —— وہ اپنے نفس پر پردہ ڈالنے کے لیے ڈینگیں مارتا تھا کہ یہ بھگوان کی عبادت ہے یہ عبادت نہیں بلکہ گناہ کبیرہ ہے۔ رام لال کے بچّے اس کی شہوانی بھوک کے پیداوار ہیں۔

"ارے بھئی سعادت" چھوٹو رام نے ملتجیانہ انداز میں کہا۔ "اب خاموش بھی رہو گے یا نہیں۔ ہمیں تو کام کرنے دو۔ اس کے پیچھے کیا پڑے ہو۔ ابھی کالج کی چار دیواری سے باہر نکلا ہے خود بخود ٹھوکریں کھا کر سیدھا ہو جائے گا۔"

"ٹھوکریں ... کیا ٹھوکریں کھائے بغیر سیدھا ہونا ممکن ہی نہیں ؟"

سعادت مسکراتا ہوا اپنی کرسی کھینچ کر پھر اپنی میز پہ چلا گیا۔ اور دھیرے دھیرے گنگنانے لگا —— "گر گئی رے مورے ماتھے کی بندیا" میری نظروں کے آگے فائیلوں اور لیجروں کے گٹھے پڑے ہیں مگر میرا دماغ اور کان سعادت حسن کے پاس تھے۔ الٰہی۔ یہ مجھے کیسے تلخ زبان انسانوں سے سابقہ پڑا ہے۔ چھوٹو رام کہتا ہے کہ اگر میں نوکری چھوڑ دوں تو میری منگیتر دُوسرے چالیس روپے کمانے والے کے سپرد کر دی جائے گی۔ سعادت حسن کہتا ہے۔ چالیس روپے کمانے والے کے لیے شادی ایک صریح حماقت ہے۔ الائچی جان کہتی ہے

کہ اس دیس میں عورت کے ماتھے کی بندیا گر گئی ہے۔ کیسے عجیب لوگ ہیں یہ خود غرض مگر بے انتہا سچے۔ نہ زبان پر روغن قاز نہ تعلقات میں چکناہٹ۔

میرا دل بھر آیا۔ گلے میں جیسے پھندا سا پڑ گیا۔ بہ ہزار دقت کرسی سے اُٹھ کر میں نے سعادت حسن کا تھرماس کھولا۔ ایک پیالی چائے حلق میں انڈیل لی۔ چھوٹو رام کی ڈبیا میں سے ایک پان کھا کر اور سگریٹ جلا کر ایک گونہ سکون محسوس کرنے لگا۔ مگر دل برابر دھڑک رہا تھا۔ ہلکا ہلکا سا بخار بھی محسوس ہو رہا تھا۔ اور بائیں آنکھ بھی پھڑک رہی تھی جیسے آج کچھ ہونے کو ہے۔ جی چاہتا تھا کہ غلامی کے اس قید خانے سے اُٹھ کر بھاگوں —— قبر کی طرح تنگ اندھیرے گھر میں رضائی اوڑھ کر لیٹ جاؤں —— سو جاؤں اور ابد الآباد تک سوتا ہی رہوں۔

دیوار پر لٹکتے ہوئے کلاک نے دو بجائے۔ ابھی اور دو گھنٹے اس قید خانے میں گزارنے تھے۔ دو گھنٹے بلکہ ساری عمر عزیز۔

چھوٹو رام کی منمنی آواز نے مجھے پھر چونکا دیا۔

"سچ ہے۔ صاحب نے بالکل ٹھیک کہا تھا۔ کہ تم یہاں وقت گزارنے آتے ہو —— اچھا لاؤ۔ ایک سگریٹ پلاؤ۔"

میں نے بے خیالی میں سگریٹ کی خالی ڈبیا چھوٹو رام کی طرف بڑھا دی۔ چھوٹو رام نے ایک کھسیانی ہنسی میں وہ ڈبیا میرے منہ پر دے ماری اور کہا۔

"ارے آج بھی سگریٹ نہ پلاؤ گے۔ آج تو میری شادی کا دن ہے!"

چھوٹو رام کی شادی کا دن —— میں چونک پڑا مگر فوراً سمجھ کر مسکرانے

،، بہ مجبورہ ہو گیا۔ آج سنیچر ہے۔ چھوٹو رام کی بیوی اور بچے شہر سے دو کوس کے فاصلہ پر ایک گاؤں میں رہتے ہیں۔ چھوٹو رام ہر سنیچر کی شام کو گاؤں جاتا ہے اور اتوار کا پورا دن وہیں گزارتا ہے۔

"اچھا — یہ بات ہے۔" سعادت حسن نے عادتاً مسکراتے ہوئے کہا۔

"لو — چھوٹو رام میں تمھیں سگریٹ پلاتا ہوں۔ بلکہ تمہاری شادی کی خوشی میں یہ ساری ڈبیا تمھاری نذر ہے۔ مگر ایک بات کہنے کی مجھے اجازت دو۔"

"شوق سے کہو میاں۔"

"تو سنو — تمھاری بیوی بھی ایک بیسوا ہے۔"

"میری بیوی بیسوا ہے — کیا بکتے ہو سعادت؟"

چھوٹو رام غصہ سے شعلہ بھبوکا نظر آنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں شرارے مچلنے لگے۔ اس کی مٹھیاں بھینچ گئیں۔ میں سمجھا کہ آج سعادت واقعی پٹ جائے گا۔ مگر وہ نمبر ایک کا لاپروا انسان اسی لاابالی انداز میں کہنے لگا

"ہاں ہاں — تو اس میں غصہ ہونے کی بات کیا ہے۔ تم ایک عورت کو ماہوار چالیس روپے دیتے ہو اور اس کے عوض مہینہ میں چار راتیں خرید لیتے ہو۔ ہر سنیچر کی رات .. کیا تمھیں انکار ہے —؟

چھوٹو رام کا غصہ دفعتاً غائب ہو گیا۔ بڑی کوششوں کے بعد بھی وہ اپنی مسکراہٹ چھپا نہ سکا اور ہلکے ہلکے قہقہے بھی اس کے پوپلے منہ سے ابلنے لگے۔

"بہت شریر ہو تم سعادت .. ہو ہو ہو .. ..

ہو ہو ہو۔"

چھوٹو رام ایک شوخ و شنگ بچّے کی طرح بدتمیزی سے قہقہے لگا رہا تھا وہ بالکل ہی بھول گیا تھا کہ اس کی عمر اُنچاس برس ہے اور چہرے پر مکڑی کا جالا تنا ہے۔ اس نے سنجیدگی اور عمر کی کینچلی کہیں اُتار پھینکی تھی۔ سنیچر کی رات ... ... مجھے بڑے زور کی چھینک آئی ــــ فہمیدہ

... ... آک چھی ... ... الائچی جان ... آک چھی ...

چھوٹو رام کی بیوی ... آک چھی ... ...

چھوٹو رام آج مجھے گویا ننگا نظر آ رہا تھا۔ کیونکہ سعادت حسن کی سگریٹ کی ڈبیہ پر انگلیوں سے طبلہ بجاتے ہوئے وہ گا رہا تھا۔

"گر گئی مورے ماتھے کی بندیا۔ گر گئی ... ..."

میرا جسم بُری طرح جلنے لگا۔ دل بہت زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ سر میں ہلکا ہلکا سا درد اُٹھا۔ بائیں آنکھ زور زور سے پھڑکنے لگی۔ میری آنکھیں سامنے والے دروازے پر لگی ہوئی تھیں جیسے میں کسی کا بُری طرح انتظار کر رہا ہوں۔ تھوڑی دیر بعد ڈاکیہ اندر چلا آیا۔ میں نے چھوٹی جماعتوں میں پوسٹ مین پر بہت سے قصیدے پڑھے ہیں کہ پوسٹ مین کو دیکھ کر انسان تھوڑی دیر کے لیے یہ بھول جاتا ہے کہ وہ انسان ہے۔ مگر کلرکوں کے ہال میں پوسٹ مین کو کوئی اہمیت نہیں تھی۔ کیونکہ کلرک قسم کے انسانوں کا نہ کوئی رشتہ دار ہوتا ہے نہ کوئی دوست۔ ڈاکیہ میری طرف آیا۔ اور میز پر ایک خط رکھ کر چلا گیا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ کالج کے زمانہ کے کسی دوست کا ہو گا۔ جس میں اپنی انشا پردازی کا رعب یا کسی جھوٹی محبت

کی داستان ہو گی۔ المکتوب نصف الملاقات، جھوٹے اخلاق۔ اس کے سوائے دُنیا میں تعلّقات کی اور کونسی ٹھوس بنیاد رہ گئی ہے؟ میں نے لفافہ چاک کیا اور پھر دو تین سطر پڑھنے کے بعد مجھ سے کیا حرکت ہوئی۔ مجھے نہیں معلوم، البتہ چھوٹو رام اور سعادت حسن دوڑ کر میری میز کے پاس آئے اور مجھے جھنجوڑ جھنجوڑ کر کچھ پوچھنے لگے۔ جانے کیا پوچھ رہے تھے۔

وہ خط میرے چچا ابو جہل کا تھا۔ جس نے چار مرتبہ میرا انتظار کر کے فہمیدہ کی شادی ایک پچاس روپیہ والے انسان سے مقرر کر دی تھی کیا فہمیدہ کی چمک دار زُلفوں اور اس کی غزالی آنکھوں کی قیمت پچاس روپیہ سے زیادہ نہیں ہو سکتی تھی ...... ؟ گویا ایک چٹان تھی کہ میرے سینے پر دن بدن زیادہ وزنی ہوتی جا رہی تھی۔

کلاک نے چار بجائے۔ میں اور سعادت حسن باہر نکلے اُونچی اُونچی بلڈنگوں کے پیچھے سورج دم توڑ رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ شاید میرے سانحہ کا اثر کائنات پر بھی ہُوا ہے مگر کچہری کے باہر زندگی اسی شور شغف اور رعنائیوں کے ساتھ ناچ رہی تھی۔ کائنات بھی بورژوائی طلسم میں گرفتار ہے۔ بڑے آدمیوں پر جب کوئی سانحہ آتا ہے اُس وقت دُم دار ستارے نکلتے ہیں۔ آندھیاں چلتی ہیں۔ ابر روتا ہے۔ ہنگامہ و شور برپا ہو جاتا ہے۔ جولیس سیزر جب مرا تھا...... مگر چھوٹے آدمیوں کی زندگی کے حادثات کی کسی دُمدار ستارے کو خبر بھی نہیں ہوتی۔

کرافورڈ مارکٹ کے فٹ پاتھ کے قریب سے ایک اینگلو انڈین سُرخ و سفید

لڑکی سبز جرسی سفید نکر میں ملبوس ٹینس کا بلا سائیکل پر لٹکائے اُڑی جا رہی تھی۔ پیڈلنگ کرتے ہوئے اس کی گداز پنڈلیوں کی مچھلیاں اُبھرتی اور ڈوبتی جا رہی تھیں۔ میں نے نظر بھر کر اس لڑکی کو اس وقت تک دیکھا جب تک کہ اس کو دیکھ سکا۔ پھر ایک سگریٹ جلا کر سعادت حسن سے کہا۔

"سعادت حسن تم نے سچ کہا تھا ۔۔۔!"

سعادت حسن نے اپنی مخصوص بے پروائی سے پوچھا۔

"کیا سچ کہا تھا میں نے ۔۔۔؟"

میں نے رُکتے رُکتے جواب دیا۔

"نہیں کچھ نہیں ۔۔۔ مگر آج مجھے ساتھ لے چلو گے میں بھی الائچی جان کے ماتھے کی بندیاں ڈھونڈھنا چاہتا ہوں۔"

سعادت حسن چلتے چلتے ٹھٹک کر رُکا۔ جھک کر میری صورت دیکھی اور پھر مسکرانے لگا! جیسے میں اب واقعی سیدھے راستے پر لگ گیا ہوں۔"

سگِ لیلیٰ

کلکٹر صاحب کا حکم ایک کلرک کے لیے مرگِ مفاجات ہوتا ہے۔ چنانچہ میری موت میرے سامنے ایک سفید کاغذ پہ ناچ رہی تھی۔

"مس سارہ کا کتّا اسٹیشن سے غائب ہو گیا ہے۔ تم پندرہ دن میں اسے پیدا کرو۔"

میں نے کلکٹر صاحب کے چپراسی سے مس سارہ کے متعلق دریافت کیا۔ اس نے جواب دیا۔ "کلکٹر صاحب کی دوست ہیں۔ نئی دہلی سے آئی ہیں۔ کالج میں ان کے ساتھ پڑھتی تھیں۔"

میں نے ایک گھٹیا قسم کی سگریٹ جلا کر یارانہ انداز میں چپراسی سے کہا۔ "یار! ایک بات کہوں؟"

"کہیے!"

"بھئی بات دراصل یہ ہے کہ علی گڑھ کی نمائش میں میرا اپنا بچہ کھو گیا ہے۔ میں آج کل بہت پریشان ہوں۔ اگر تو میری طرف سے یہ کام کر دے تو اپنی تنخواہ سے تجھے پانچ روپے ۔۔۔ ۔۔"

"ارے واہ صاحب ــــ آپ نے بھی خوب کہی۔ جیسے مجھے دنیا میں اور کوئی کام ہی نہیں ہے۔"

اور وہ مجھ پر گویا ایک حقارت بھری نظر ڈالتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

اسے اس طرح جاتے دیکھ کر میرے منہ سے یہ دبی دبی آواز نکلی۔

"اے کلکٹر صاحب کا کلرک، اور مس سارہ کا کتا پیدا کرنے والے خدا! کیا مجھے دنیا میں اور کوئی کام نہیں ہے کیا یہی ہے تیری قدرت کا نظام، میرا اپنا بچہ کھو گیا ہے۔ میں پریشان ہوں۔ مگر حکم ملا ہے کہ مس سارہ کے کتے کو ڈھونڈھ نکالوں۔ کیا تو بھی میرا ہمدرد نہیں اور اگر ہے تو میری کمزور پیٹھ پر کیوں یہ تازیانے لگاتا ہے۔ میں تو بہت ہی جلد بلبلا اٹھتا ہوں۔"

میری آنکھوں کے آگے میری پیلی پیلی رنگت والی میری کمزور بیوی بین کر رہی تھی "میرے لال کو ڈھونڈ لائیے ــــ مجھے میرا ننھا واپس دلائیے!"

میری آنکھوں میں بے اختیار آنسو چھلک آئے ــــ مگر یہ نہیں ہو سکتا۔ کلکٹر صاحب کے کلرک کا بچہ مس سارہ کے کتے سے زیادہ قیمتی نہیں ہو سکتا۔ پہلے اس کتے کی تلاش کی جائے گی۔ انعام و اکرام ملے گا۔ تنخواہ بڑھ جائے گی۔ اور میرا مستقبل کلکٹر صاحب کے چمکدار جوتے کی طرح جگمگا اٹھے گا۔ میں کلرک سے ہیڈ کلرک ہو جاؤں گا۔ سبز بانات والی بڑی میز پر بیٹھوں گا۔ میری

بیوی کے زرد زرد گالوں پر سیب کی سی سُرخی پیدا ہو جائے گی۔ اور پھر
میں کئی ایسے لال اور ننّھے اُسے لا دُوں گا۔

اس خیال نے میرے جسم میں توانائی آنکھوں میں چمک اور ارادے میں
مضبوطی پیدا کر دی۔ خلافِ معمول کلکٹر صاحب کی طرح سیدھا تن کر چلتا ہُوا
ان کے اجلاس پر پہنچ گیا۔ اور آداب بجا لا کر دُور ہی کھڑا ہو گیا۔ اُنھوں
نے کنکھیوں سے میری طرف دیکھ کر حاکمانہ لہجے میں فرمایا۔

"ویل! تمھیں حکم مل گیا۔"

"جی ہاں"

"پھر تم یہاں کیوں آئے؟"

"صاب ــــ ذرا کُتّے کا حُلیہ دریافت کرنا چاہتا ہوں تاکہ شناخت میں
آسانی ہو۔

"آچ ــــ چھا ــــ ٹھیرو، ابھی ابھی مس سارہ آنے والی ہیں۔ وہ خود تمھیں
حُلیہ بتا دیں گی۔"

میں ہاتھ باندھے خاموش کھڑا رہا۔ اس عرصہ میں کمبخت کھانسی نے مجھے ایسا
ستایا کہ کچھ کہہ نہیں سکتا۔ کئی بار گلے میں خراش سی محسوس ہوئی۔ مگر جونہی
صاحب کے تر و تازہ گورے گورے ٹماٹو سے چہرے پر نظر پڑی۔ کھانسی
گویا حلق میں اٹک کر رہ گئی۔ اس اثنا میں باہر موٹر کا ہارن بجا۔ صاحب
نے قلم فوراً کشتی میں رکھ دیا اور مسکراتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ دروازہ
کا پردہ اُٹھا اور میں نے دیکھا کہ وہاں حُسن ایک انسانی پیکر اختیار کیے کھڑا تھا۔

اور جب وہ لچکتی ہوئی آگے بڑھی تو میں لڑکھڑا یا، رنگ و بُو کا ایک سیلاب تھا کہ اُمڈا آرہا تھا۔ میرے دل میں ایک فوری تمنّا ہڑبڑا کر جاگ اُٹھی۔

"کاش میں عورت ہوتا ––– کاش میں مس سارہ ... ... "

تھوڑی دیر بعد مس سارہ مجھ سے مخاطب ہوئیں۔

"ہاں تو میرے کُتّے کا رنگ سیاہ ہے۔ لمبے لمبے بال ہیں۔ سیاہ چمکدار آنکھیں۔ اور ... ... "

میری آنکھوں میں یکایک آنسو آ گئے۔ مس سارہ نے حیرت سے اپنی مرمریں گردن میں ہلکا سا خم دیتے ہوئے پوچھا۔

"تم رونے لگے ... ... کیوں؟"

میں اس وقت اپنے جذبات نہ چھپا سکا۔

"میڈم۔ میرا اپنا بچّہ بھی کھو گیا ہے۔ اس کا رنگ بھی سیاہ ہے۔ سر پر لمبے لمبے بال ہیں۔ اور آنکھیں ... ... "

مگر فوراً ہی میں اپنے آپ میں آ گیا ––– ارے میں کیا بک رہا ہوں۔ بڑی ندامت سے میں نے آنکھیں جھکا لیں۔

مس سارہ نے غور سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

اوہ ––– مجھے تم سے بڑی ہمدردی ہے ––– پر یاد رکھو میں آج اوٹی جا رہی ہوں۔ ۳۰ جولائی تک لوٹ آؤں گی۔ اس وقت تک میرا کُتّا ضرور مل جائے۔

میں نے دل ہی دل میں اس جُملے کے آخری الفاظ کو دُہرایا۔ "کُتّا ضرور مل جائے"۔ اور باہر چلا آیا۔ مجھے اپنے آپ پر بُری طرح غصّہ آرہا تھا کہ میں نے

یہ سب غیر ضروری باتیں وہاں کیوں کہہ دیں۔ میں کتنا ذلیل ہوں۔ کتنا گرا ہوا انسان ہوں۔ میں اپنا گلا آپ دبا دینا چاہتا ہوں۔

میں واقعی ذلیل انسان ہوں۔ کچھ عجیب بات ہے کہ اس وقت مجھے یونیورسٹی کا ایک بھولا بسرا پروفیسر یاد آگیا جس نے علامہ اقبال کا "فلسفہ خودی" سمجھاتے ہوئے ایک موٹی سی مثال سمجھائی تھی کہ پہلے اپنے آپ کو ڈھونڈ پھر کسی چیز کے ڈھونڈھنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ مگر میں کہوں "اقبال کا فلسفہ خودی غلط ـــــ پروفیسر کی تاویل غلط۔ پہلے مس سارہ کے کُتّے کو ڈھونڈ تاکہ اپنے آپ کو ڈھونڈھنے میں آسانی ہو۔

اُسی دن مجھے تنخواہ ملی۔ میں نے اخبارات میں اشتہار چھپوا دیا۔ اور کُتّا ڈھونڈنے والے کے لیے اپنی طرف سے پانچ روپیہ کا انعام بھی مقرر کیا اور پھر دن بھر کرایہ کی سائیکل پر بڑی سے بڑی شاہراہ اور تنگ سے تنگ گلی میں کُتّے کی تلاش میں مارا مارا پھرنے لگا۔ اس طرح آٹھ ہی روز میں میرے گیارہ روپے خرچ ہو گئے۔ میں نے اس کی کوئی پروا نہیں کی۔ کیونکہ مجھے اپنا مستقبل جگمگاتا نظر آرہا تھا۔

نویں دن سویرے ہی سویرے میں گھر سے باہر نکل رہا تھا کہ ایک ذلیل سا آوارہ انسان ایک سیاہ رنگ کے لمبے لمبے بالوں اور چمکدار آنکھوں والے کُتّے کو لیے دروازے پر کھڑا نظر آیا۔ میں خوشی سے جیسے چیخ اُٹھا۔

"ارے ـــــ کہاں ملا یہ تمہیں؟"

"بس مل گیا صاب ۔۔ حجور وہ انعام کے پانچ روپلے۔

میں نے فرطِ مسرت سے سر کو خاص انداز میں ہلاتے ہوئے پاکٹ میں سے

پانچ روپے نکالے اور اس کی مٹھی میں دے کر گیتے کو لیے خوشی خوشی اندر دوڑا۔
"دیکھتی ہو مس سارہ کا کتا۔ لے اب خوش بھی ہو جاؤ۔ سامنے دیکھو مستقبل جگمگا رہا ہے۔"

مگر میری بیوی دالان کے ستون کا سہارا لیے نیلے نیلے آسمان کو اداس نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ میں نے اس کے قریب جا کر کہا۔
"آسمان کی طرف کیا دیکھتی ہے تو۔ آسمان تو کوئی چیز نہیں۔ ایک نیلا رنگ ہے۔ سراب ہے۔ نظر کا دھوکا ہے۔ اس سے ہمیں کوئی امید وابستہ نہیں رکھنا چاہیے۔ بہت پچھتائے گی تو۔ اس کے اوپر اگر کوئی رہتا ہے۔ تو رہا کرے۔ ہمارا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ بھی ایک سراب ہے۔"
مگر میں فوراً سر سے پیر تک لرز گیا۔ جانے کیا بات ہوئی میں دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ بہت دیر تک رویا۔ اس دن جتنا رویا۔ شاید عمر بھر کے لیے کافی تھا۔
مس سارہ کے آنے میں ابھی پندرہ روز باقی تھے۔ کتا کہیں دبلا نہ ہو جائے۔ اسی لیے میں روزانہ تازہ گوشت اسے کھلایا کرتا تھا۔ اور انھی اخراجات کے لیے میں نے اپنی بیوی کو سمجھا بجھا کر اس کا چاندی کا جھومر بھی ایک بنیے کے پاس رہن رکھ دیا۔ میری رگ رگ میں نئی زندگی کی تمنا کروٹیں لے رہی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ چند ہی دنوں میں میری زندگی میں بہار آجائے گی۔ اور بیوی کے ماتھے پر ایک سونے کا جھومر لہرائے گا۔
سولہ جولائی ـــ سترہ جولائی اور بالآخر تیس جولائی آگئی۔ یہ دن میرے لیے گویا عید کا دن تھا۔ اس دن میں نے اپنی شادی کا ٹوئیڈ سوٹ پہنا۔

سورج پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ مجھے دنیا کی ہر چیز سہانی معلوم ہو رہی تھی۔ آسمان اب میری نظروں میں سراب نہیں تھا اور مجھے یقین ہو رہا تھا کہ آسمان کے اوپر بھی کوئی عظیم ترین طاقت ہے جو دنیا کا اتنا بڑا انتظام چلا رہی ہے ــ ایک مضحکہ خیز خیال میرے دل میں آیا کہ ایسے ہی سہانے دن میری زندگی میں آتے رہیں تو نہ جانے میں کتنا موٹا ہو جاؤں اور میرا وزن کتنے پونڈ بڑھ جائے۔

ایک شانِ بے نیازی سے سگریٹ منہ میں دبائے کُتّے کی زنجیر تھامے میں نے دفتر کا رُخ کیا۔ مگر راستے میں کلکٹر صاحب کے چپراسی نے کہا۔ "کلکٹر صاحب اور مس سارہ اسٹیشن پر آپ کا انتظار کر رہے ہیں" میں ایک کرائے کے تانگے پر لد کر اسٹیشن پہنچا۔ پلیٹ فارم پر کلکٹر صاحب کی بغل میں اونٹی سے آئی ہوئی مس سارہ بہت موٹی معلوم دے رہی تھی۔ جونہی اس نے اپنے کُتّے کو دیکھا خوشی سے "مائی ٹیگر" کہتی ہوئی لپکی۔ اس کی آنکھوں میں دو ننّھے ننّھے آنسو تھے ــ شاید میرے مستقبل کے دو جگمگاتے ستارے۔ بڑی محبّت سے اُس نے کُتّے کے لانبے لانبے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کلکٹر صاحب کی طرف دیکھ کر کہا۔

"میرا ٹائیگر کتنا دُبلا ہو گیا ہے۔"

میں سٹ پٹا گیا اور کہنا چاہتا تھا کہ میم صاحب یہ کیا کہتی ہیں آپ، اس کو تو سیروں گوشت کھلا کھلا کر پالا ہے مگر میں مس سارہ اور اس کے کُتّے کو دیکھ کر کچھ اس انداز میں مسکرایا کہ کچھ بھی کہہ نہ سکا۔

اسی اثنا میں گارڈ نے سیٹی دی اور مس سارہ نے چونک کر کہا۔

"او تھینک یُو ویری مچ" اور پھر اس نے پانچ روپے کا نوٹ نکال کر میری طرف ہاتھ بڑھایا۔

"پانچ روپے کا نوٹ ـــ؟"

میں نے تھرتھراتے ہوئے ہاتھوں سے پانچ روپے کا نوٹ لیا۔ میرا سر چکرا رہا تھا۔ مجھے یوں دکھائی دیا۔ جیسے مس سارہ نے میری بیوی کے پیلے ماتھے سے چاندی کا جھُومر چھین کر اپنے ماتھے پر لگا لیا ہے اور مس سارہ کا کُتّا میری ٹانگ زور زور سے کھینچ رہا ہے ـــ پانچ روپے کا نوٹ ہوا کے ایک بگولے کے ساتھ اُڑا جا رہا ہے اور میں کوشش کر رہا ہوں کہ آسمانوں کی بلندیوں سے بھی اُوپر ـــ ساتویں آسمان سے کہیں پرے چلا جاؤں، مگر آسمان سراب ہے دھوکا ہے۔

بڑی دیر بعد میں گھر لوٹا۔

میری کمزور بیوی صحن میں چارپائی پر اوندھی لیٹی دروازے کی طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی تھی۔ اس کی رنگت خطرناک حد تک پیلی ہو گئی تھی۔ میری آہٹ پا کر وہ پکار اُٹھی "ڈھونڈ لائے میرے لال کو ـــ؟"

اور میں دونوں ہاتھوں سے اپنے مکروہ چہرے کو چھپائے سیدھا اپنے کمرے کو نکل گیا۔

دِلدار

جب تک اس کی نوجوان لڑکی زندہ تھی۔ وہ اس کی عصمت بیچ بیچ کر اپنا پیٹ بھرتا رہا۔ لیکن جب وہ بھی مرگئی تو اس کو بھیک مانگنے کی نوبت آگئی۔ اور سوائے بھیک مانگنے کے اور چارہ ہی کیا تھا؟ اس میں تو چلنے پھرنے کی بھی توانائی نہ تھی جذام سے ہاتھ پیر کی انگلیاں گل سڑ گئی تھیں۔ ناک سُوج کر پکا ہوا زخم بن گئی تھی۔ برص نے جسم کی جلد چھیل دی تھی۔ پچھلی جنگِ عظیم میں اپنا ایک پاؤں اتحادیوں کی فتح کی خوشی میں جنگ کے دیوتا کو بھینٹ دے چکا تھا۔ قبل از وقت بڑھاپے نے چہرے پر کچی کچی جلد کو لاتعداد جھُریوں میں سمیٹ رکھا تھا جیسے اس کا چہرہ ایک سیج تھا جس پر زندگی ایک بیسوا کی طرح لوٹتی رہتی تھی۔ اس کی سُرخ سُرخ میلی آنکھوں میں ہمیشہ ایک مبہم سا ڈر چھایا رہتا تھا۔ جیسے وہ اپنی موت کو بہت قریب سے دیکھ رہا ہو —— وہ واقعی موت

سے بہت قریب تھا، لیکن موت سے بچ نکلنے اور دُور ہونے کے لیے اُس نے میرے گھر کے مقابل والے رومن کیتھولک گرجا کی سیڑھیوں پر پناہ لی تھی۔ جہاں گرجا کی ایک نوجوان سیاہ فام چھوکری اس کو صبح و شام ایک روٹی دے دیا کرتی تھی۔ میں نے دیکھا ہے۔ روٹی لیتے وقت وہ اس لڑکی سے ایک اور روٹی اور بہت سی روٹیوں کے لیے گڑگڑایا کرتا تھا تاکہ وہ اتنا کھالے کہ اسے نیند آجائے۔ اس کی آنکھوں پر پپوٹے ڈھک جائیں۔ پھر موت نہ نزدیک سے دکھائی دے اور نہ دُور سے ... وہ لڑکی شاید نئی نئی کرسچین ہوئی تھی۔ اسی لیے اس کو بائبل یاد تھی اور وہ اس کو بائبل کے وہ جُملے سنایا کرتی تھی جن میں انسان کو حرص اور لالچ سے بچنے کی تلقین کی گئی ہے، مگر بھوکے پیٹ، اچھے خاصے پڑھے لکھے انسان کو بائبل اور اسی قسم کی آسمانی کتابوں پر اعتماد نہیں ہوتا تو، وہ تو محض ایک جاہل ان پڑھ بھکاری تھا۔ لڑکی جب اندر چلی جاتی تو وہ لڑکی کی ان نصیحتوں کو یاد کرکے آپ ہی آپ مُسکراتا۔ جیسے وہ اس کو صرف ایک بھولی بھالی اور کچّی عقل کی لڑکی سمجھتا ہے۔

ایک دن اس نے اس لڑکی سے مزید ایک روٹی کے لیے بہت ضد کی۔ بچّہ کی طرح مچل گیا۔ اس لڑکی نے اس کو سمجھایا کہ وہ گرجا کی صرف ایک ادنیٰ نوکرانی ہے۔ جو کھانے میں ایک روٹی بچا کر چوری چُھپے اس کو دے دیا کرتی ہے لیکن بُڈھا اپنے ارتقا یعنی بچپنے پر پہنچا ہوا تھا۔ اس نے لڑکی کا میلا فراک مضبوطی سے پکڑ لیا۔ اور جیسے مدّتوں بعد پہلی بار مسکرایا اور پھر شرارت بھری نظروں سے اس کو دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

"تو نوکرانی ہے ___؟ تو نوکرانی کیوں ہے ___؟ تو کب تک نوکرانی

رہے گی ——؟ اری پگلی چپکے سے گرجا چھوڑ کر میرے ساتھ چلی آ۔ میں بھکاری سہی لیکن تجھے مہارانی بنا سکتا ہوں۔ میں اپنی لڑکی کو مہارانی بنا رہا تھا لیکن کمبخت مر گئی —— ایک جاگیردار اس کو مہارانی بنانے والا تھا۔ اب بھی وہ اس کے لیے تڑپ رہا ہے۔ آ تو ہی میری بیٹی ہے۔ تو ہی اس کی مہارانی ہے۔"

لڑکی چپ چاپ اپنا اترا ہوا چہرہ اٹھائے اس کی باتیں سنتی رہی اور جب وہ سن نہ سکی تو یکایک دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا کر روتی ہوئی اندر بھاگ گئی۔ بوڑھا قہقہے مار مار کر ہنسا اور بڑبڑانے لگا۔

"پہلے دن میری بیٹی بھی ایسے ہی روتے ہوئے اندر بھاگ گئی تھی۔ لیکن رات کو وہ خود ہی لالٹین لیے مجھے جاگیردار کے گھر چلنے کے لیے کہنے لگی۔ آہاہاہا —— آہاہاہا۔"

لیکن گرجا کی نوجوان نوکرانی شام کو وہاں آئی اور نہ دوسرے تیسرے دن۔ بوڑھا غضبناک ہو کر دو روز سے برابر چیخ رہا تھا۔

"بھگوان بھلا کرے۔ رام بھلا کرے۔"

گرجا میں آنے جانے والے کالے انگریز جو پہلے بھگوان اور رام کو بہت مانتے تھے۔ اور اب زندگی کی نامساعد مجبوریوں اور رزق کی مصیبتوں کے باعث آج بائیبل پر ایمان لے آئے تھے۔ اپنی ناکوں پر رومال رکھے گزر جاتے تھے۔ اور بوڑھا مایوس ہو کر گالیاں بکنے پر اتر آتا تھا۔ میں خود بھی دو روز سے برابر اس بھکاری کو تڑپتے دیکھ رہا تھا۔ لیکن اپنے کھانے سے ایک لقمہ تک

اس کو نہیں دیا۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ اب زندہ نہ رہے۔ مجھے بے مصرف اور بیکار رہنے والے انسانوں کو زندہ دیکھنا مطلق گوارا نہیں اور یہ بوڑھا تو اتنا ناکارہ ہو چکا تھا کہ اس سے مستقبل میں بھی کسی مصرف کی اُمید نہ تھی۔ کہ سماج میں اس کی بے مصرف زندگی بصورت خاص گوارا کر لی جاتی مگر یہ بوڑھا پھر بھی جینا چاہتا تھا۔ ایک کے بجائے دو روٹیاں مانگتا تھا۔ قریب آتی ہوئی موت کو دھوکا دے کر اس کے راستے سے بچ کر نکلنا چاہتا تھا اور اس طرح اس تخیل پر کہ زندگی صحت اور تندرستی کا نام ہے بڑا ہی مزیدار طنز کر رہا تھا۔

چوتھے دن میرے گھر کے آگے سے ایک نو عمر بھکاری کسی سستے قنوطی شاعر کی دُنیا کی بے ثباتی پر لکھی ہوئی نظم گاتا ہوا گزر رہا تھا۔ میں نے دوڑ کر اس کو آواز دی۔ اور اس بوڑھے کی گھورتی ہوئی نظروں کے سامنے اس لونڈے کو دوّنی دی۔ بوڑھا بھکاریوں کی عام عادت کے مطابق آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے چیخا۔

"ارے بھگوان —— کوئی بھی مجھے بھیک نہیں دیتا رے۔

مگر اس کی اس گرجتی ہوئی مایوس آواز نے میرے دل کے کسی نرم حصّے پر بھی کوئی اثر نہیں کیا۔ میں بھیک دینے کا قائل نہیں ہوں لیکن نوعمر بھیک منگوں اور نوجوان بھکارنوں کو ڈھونڈھ ڈھونڈ کر بھیک دیتا ہوں۔ مجھے زندگی کی ثبات کے لیے دعائے خیر کی ضرورت ہے اور نہ مرنے کے بعد جنّت چاہیے۔ البتّہ میری ایک تمنّا ہے کہ ان نوعمر بھکاریوں اور بھکارنوں کو جنھیں بھیک مانگنے کی مستقل عادت نہیں ہے مستقل اور دوامی عادت ہو جائے اور اس طرح آنے

والی نسل کا ہر انسان بھکاری ہو جائے۔ میں اسی لیے ہر نو عمر بھکاری کی حوصلہ افزائی کرتا ہوں۔ مگر مجھے نو عمری کی غیر مستقل مزاجی اور جلد جلد بدلنے والی طبیعتوں سے بڑی جھلاہٹ ہوتی ہے۔ ایک نوجوان بھکارن کو میں ایک بڑے عرصے تک مُنہ مانگی بھیک دیتا رہا۔ لیکن ایک دن وہ ایک لاری ڈرائیور کے ساتھ بھاگ گئی۔ اور اب اس کی "غیر شادی شدہ بیوی" بن کر اس کے ہر قسم کے مظالم سہتی ہے —— ایک اور لڑکا جس کو بھیک مانگنے کے نئے نئے طریقے میں نے سکھائے تھے۔ وہ کمبخت اب ایک چھوٹی سی گندہ ہوٹل میں ایک محدود تنخواہ پر نوکر ہو گیا ہے۔ ان نو عمر چھوکروں اور چھوکریوں کی اس بے راہ روی سے مجھے اندیشہ ہوتا ہے کہ آنے والی نسل کو بھکاری بنانے کی میری اسکیم ناکام ہو کر رہ جائے گی۔

اب یہ لونڈا جس کو میں نے ایک دوّنی دی۔ میری توقع کے خلاف بڑے کم ظرف دل کا نکلا۔ فاقہ مستی تو دیکھنا کہ بُوڑھے کی آواز سے چونک کر ٹھہر گیا۔ بڑی دیر تک ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے اس بوڑھے مکّار۔ لالچی بھکاری کو دیکھتا رہا اور پھر میری دی ہوئی دوّنی اس بوڑھے کو دیتے ہوئے میری ہتک کر دی۔ میں نے اس وقت معاً ایسا محسوس کیا جیسے اس نے وہ دوّنی اس بوڑھے کو نہیں دی بلکہ مجھے واپس لوٹا دی ہے —— وہ ناتجربہ کار لونڈا اس کائیاں بُڈھے کے جھانسے میں آکر اس سے کہہ رہا تھا۔

"بابا —— یہاں پڑے رہو گے تو کبھی بھیک نہ ملے گی۔ جاؤ۔ وہاں حوالدار کی پُرانی کوٹھی میں کہیں سے ایک بیوہ ٹھکرائن اُتری ہے۔ عورت نہیں دیوی ہے۔

دیوی ـــ یہ دیکھا ـــ ایک روپیہ۔ بابا جاؤ سب دلدّر دُور ہو جائے گا۔"

اس لونڈے کے چلے جانے کے بعد بڑی دیر تک میں اپنے کمرے کی کھڑکی سے اس بوڑھے کو دیکھتا رہا۔ اب اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں جیسے میلی دُھندلی آنکھوں میں چاندی کے روپے کی ساری جگمگاہٹ سرایت کر گئی ہو۔ وہ آپ ہی آپ بڑبڑا رہا تھا۔

"دیوی ہے دیوی ـــ سب دلدّر دُور ہو جائے گا۔"

وہ ابھی بڑبڑا رہا تھا کہ گرجا کی سیڑھیوں پر وہی گرجا کی چھوکری نمودار ہوئی اور اس نے نفرت سے مُنہ دوسری طرف پھیرتے ہوئے ایک روٹی اس بوڑھے کی طرف پھینک دی۔ بوڑھے نے خلافِ توقع ایک دم اس روٹی کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا۔ بلکہ لڑکی کی طرف اپنی مخصوص شرارت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے مسکراتے ہوئے بولا۔

آخر تُو آگئی نا۔ مجھے یقین تھا کہ تُو ضرور آئے گی۔ مجھے معلوم تھا کہ تجھے مجھ سے محبّت ہے۔ آہ ہا ہا۔ آہ قا قا قا۔"

یہ جملے اور یہ مصنوعی ہنسی سُن کر میرے رگ و پے میں جیسے انگارے لپکنے لگے۔ محبّت۔ کتنی عجیب سی بات! اس بدبخت بوڑھے سے شاید اس کی جیسی کوئی جذامی کوڑھی بُڑھیا بھی محبّت نہ کرے لیکن یہ خبیث ایک نوجوان چھوکری سے کہہ رہا تھا کہ اس کو اس سے محبّت ہے ـــ مرد عورت کو شاید مرتے وقت بھی پاک نظروں سے نہ دیکھے! یہ پاجی لالچی بڈھا اب موت کے مُنہ کا نوالہ ہے لیکن ابھی تک دو کے بجائے تین روٹیاں مانگتا ہے اور صرف روٹی ہی نہیں

بلکہ ایک نوجوان چھوکری سے محبّت بھی - اور وہ چھوکری بھی کچھ عجیب تھی - اس کی ان باتوں پر ہنس رہی تھی - جیسے اس کو واقعی اس سے محبّت ہے -

اس کی پھینکی ہوئی روٹی جب ایک مریل سے بھوکے کُتّے نے چپکے سے دبوچ لی - تو وہ چیخ پڑی -

بابا ــــ دیکھو کتّا تمھاری روٹی لیے جا رہا ہے -

بوڑھے نے وہیں سے اُچھل کر کُتّے کی گردن پکڑ لی اور اس کے جبڑوں سے روٹی چھین کر کُتّے کی ماں کو گیدڑ سے بیاہتے ہوئے روٹی کو مُنہ میں ڈبڈباتی ہوئی رال کے ساتھ نرم کر کے اس بری طرح چبانے لگا - جیسے اس کے مُنہ میں پوری بتّیسی ابھی موجود ہے - ابھی روٹی پوری طرح ختم نہ ہوئی تھی - وہ لڑکی سے ایک اور روٹی کی فرمائش کرنے لگا - مگر وہ لڑکی خاص لڑکیوں کے بھولے بھالے انداز میں اس کو ٹھینگا بتاتی ہوئی اندر بھاگ گئی - بوڑھے نے اپنی میلی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے پچاسی برس کی عمر میں بہت بڑی دُنیا دیکھی تھی - وہ شاید لڑکی کے کھلے ہوئے چہرے کا راز جان گیا اور بڑبڑانے لگا -

" جانے بیچاری کس کے جال میں پھنس گئی - کوئی نوکر ہی ہو گا - اس کی طرح - میں تو اس کو مہارانی بنا دیتا - خیر - اب چل یہاں سے حوالدار کی پُرانی کوٹھی - لونڈے نے کہا تھا - عورت نہیں دیوی ہے دیوی - سب دلدّر دُور ہو جائے گا - "

وہ اپنا کشکول اُٹھائے فٹ پاتھ پر آہستہ آہستہ رینگنے لگا -

حوالدار کی پُرانی کوٹھی اس گرجا سے چار میل سے کیا کم ہو گی لیکن زندگی کا

لالچ اس زندہ لاش کو گھسیٹ رہا تھا۔ اپنی مرتی ہوئی زندگی کو موت کے مُنہ سے بچانے کے لیے۔ لیکن اب وہ جس راستے سے بچ نکلنا چاہتا۔ موت اس کا راستہ گھیر کر کھڑی ہو جاتی۔ لیکن اس کو یقین تھا کہ وہ ابھی مر نہیں سکتا۔ مجھے پہلی بار اس بوڑھے پر رحم آگیا اور میں نے مجبور ہو کر اس کو ایک روپیہ اور چند روٹیاں دیتے ہوئے نصیحت کی کہ تم اتنی دُور نہ جاؤ۔ تم میں چار میل چلنے کی توانائی نہیں۔ کل کے مرنے والے آج مر جاؤ گے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میں چاہتا ہوں کہ تم مر جاؤ۔ لیکن میں نے تم جیسا زندگی کا جانباز عاشق نہیں دیکھا۔ میں تم سے زیادہ اچھی زندگی بسر کر رہا ہوں لیکن مجھے زندگی سے اتنا عشق نہیں۔ اگرچہ زندگی عشق کیے جانے کے لائق ہے۔ تم ایک بھکاری سہی لیکن تم نے اپنے بے پناہ عشق سے زندگی کو نوازا ہے۔ اس لیے تم اتنی دُور نہ جاؤ۔

اس نے وعدہ کر لیا کہ وہ اب کہیں نہیں جائے گا۔ جب تک موت خود آ کر اس کو گلے سے نہ لگا لے۔

لیکن اسی دوپہر کو جب کالے کالے بادل خوب گھر کر آسمان پر چھائے ہوئے تھے۔ دوپہر کا آگ برسانے والا سورج کالے کالے بادلوں کی اوٹ میں چھپا ہوا تھا۔ میں نے دیکھا کہ گرجا کی سیڑھیاں خالی تھیں اور اس بوڑھے کا کہیں پتہ نہ تھا۔ میں اس وقت بیکار تھا۔ میں تو بی۔ اے کامیاب کرنے کے بعد آج پورے تین سال سے بیکار ہوں اور انھی خرافات کے پیچھے اپنی زندگی کو متحرک رکھتا ہوں۔ سوچا کہ چلو۔ حوالدار کی کوٹھی تک ہی ہو آئیں۔ شاید وہ خبیث وہاں بھی پہنچ گیا ہو۔ جب میں حوالدار کی کوٹھی پہنچا تو اس کوٹھی کے بالکل سامنے برگد

کے پیڑ تلے وُہی لالچی بیٹھا ہُوا آوازیں لگا رہا تھا۔

"بہت دُور سے آس لگائے آیا ہوں دیوی! چار روز سے بھُوکا ہوں"۔

کوٹھی کے اندر سے رامائن کی کہانی ایک میٹھی نسوانی آواز میں گھُل کر فضا میں پھیل رہی تھی اور بادل کسی چوری چھپی کی محبّت میں ٹھکرائی ہوئی لڑکی کی طرح چپکے چپکے رو رہا تھا۔ میں نے اسی برگد کے پیڑ کے نیچے پناہ لی جس کے سائے میں وہ بوڑھا پیڑ کا تکیہ بنائے نیم دراز تھا۔ میں نے غصّہ سے اس سے کہا۔

"لالچی کُتّے ـــــ میں نے آج ہی صبح تمہیں کئی وقتوں کی روٹیاں دیں اور ایک روپیہ بھی دیا۔ اور میرے منع کرنے کے باوجود بھی تم چار میل دُور چلے آئے۔ لیکن پھر بھی تم چیخ رہے ہو کہ چار روز کا بھُوکا ہوں۔"

اُس نے اپنی دونوں میلی سُرخ دُھندلائی ہوئی آنکھوں سے گھُور کر میری طرف دیکھا اور بڑی گرجدار آواز میں چیخا۔

"دیوی ـــــ چار روز کا بھوکا ہوں۔ بڑی دُور سے آس لگائے آیا ہوں۔"

اس کی گرجدار آواز سُن کر وہ دیوی دوڑی بالکونی میں آئی۔ بارش تھم چکی تھی۔ لیکن بُوڑھا سر سے پاؤں تک بھیگا ہُوا تھا۔ اب اس کی گردن ایک جانب ڈھلکی ہوئی تھی۔ بیوہ ٹھکرائن نے چاندی کے دو چمکدار سکّے اس کی طرف پھینکے۔ سکّوں کے چھناکے سے بوڑھا چونک اُٹھا۔ اس کی آنکھیں چاندی کے سکّوں کی چمک سے دمکنے لگیں۔ سامنے کیچڑ پر دو سکّے پڑے

جگمگ جگمگ کر رہے تھے۔ وہ اب بڑی مطمئن آواز میں بڑبڑایا۔

"ہو گیا — میرا دلدّر دُور ہو گیا۔"

یہ کہتے ہوئے وہ آہستہ سے اُٹھا مگر یکبارگی کیچڑ میں مُنہ کے بل گرا۔ اس کا لرزتا ہُوا ہاتھ سکّوں کی طرف بڑھا۔ اور لرز کر رُک گیا۔ اُس نے دیوی کی طرف دیکھا اور مُسکراتے ہوئے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ان سکّوں کی طرف دیکھنے لگا۔ مگر دفعتہً ایک جھٹکے کے ساتھ اس کا سر گیلی دھرتی سے لگ گیا۔

٭ ٭ ٭

موت بھی کہاں حائل ہوئی... بھکاری اور بھیک کے ... بالکل بیچوں بیچ۔ لیکن اب اس کا سب دلدّر دُور ہو چکا تھا۔ اور اس کی کھُلی ہوئی بے نور آنکھوں سے زندگی کا لالچ —— زندگی کا عشق ابھی تک جھانک رہا تھا٭

ریلیف فنڈ

رم جھم ... رم جھم بارش پڑ رہی تھی۔ اور میں پیپل کے سہارے کھڑا آنسوؤں میں نہائے ہوئے بام دور کو دیکھ رہا تھا۔ اس وقت مجھے ایک ایسی ہی بھیگی ہوئی شام یاد آ رہی تھی۔ جب میں نے فاطمہ کی آنکھوں کے آنسو پونچھ کر اس کو ہمیشہ کے لیے خدا حافظ کہا تھا۔ اس کو یاد کرنا گویا اپنی رُوح کے زخم کریدنا تھا۔ مگر سامنے ایک اُجلی کوٹھی کی تیسری منزل پر کھڑکی میں سے جھانکتی ہوئی ایک پیلی لڑکی اُودے اودے بادلوں کو ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے گا رہی تھی ... اُمنڈ اُمنڈ کر میگھا برسے۔

وہ لڑکی فاطمہ کی ہم شکل تو نہ تھی لیکن اس کی پیلی رنگت اور آنسو بہاتی ہوئی آنکھوں کو دیکھ کر فاطمہ کی یاد آ ہی جاتی تھی۔

اُمنڈ اُمنڈ کر میگھا برسے ... وہ میرے وجود سے بے خبر تھی۔ اسی لیے

گھٹاؤں کو اس طرح اُمنڈ اُمنڈ کر برسنے کی دعوت دے رہی تھی۔ میں اس کو متوجہ کرنے کے لیے دو تین بار کھنکارا، کھانسا اور موٹی آواز میں نیم عشقیہ اشعار بھی گنگنائے مگر برسات رم جھم... رم جھم برستی ہی رہی اور لڑکی گاتی ہی رہی... اگر وہ میرے وجود سے باخبر بھی ہو جاتی۔ اور مجھے یوں بھیگتا، ٹھٹھرتا بھی دیکھ لیتی۔ تب بھی وہ گاتی ہی رہتی۔ کیونکہ تیسری منزل کا سطح زمین سے تعلق ہی کیا ہے ——؟ جب سے تیسری منزل فضاؤں میں بلند ہوئی ہے۔ انسانیت میں بھی اُونچ نیچ پیدا ہو گئی ہے۔ اب یہ ہم کمیونسٹ چھوکروں کی حماقت ہی تو ہے کہ تیسری منزل اور سطح زمین کی لاتعلقی کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ بھلا صرف کھانسنے اور کھنکھارنے سے یہ لاتعلقی کہیں دُور ہوئی ہے ——؟

میرا خیال صحیح نکلا۔ اس لڑکی نے ایک بار میری طرف دیکھا اور گھبرا کر اپنی آنکھوں سے آنسو پونچھ ڈالے اور پھر بادلوں میں کھو گئی جیسے اس کو میری موجودگی کا احساس ہی نہیں ہوا... تیسری منزل پر رہنے والوں کو کب احساس ہوتا ہے کہ نیچے دھرتی پر کوئی کھانستا کھنکھناتا بھیگتا ٹھٹھرتا مر رہا ہے ——

البتہ بار بار یہ بات رہ رہ کر میرے دل کو کرید رہی تھی۔ اس لڑکی کی آنکھوں میں آنسو کیوں ہیں اور وہ اتنی پیلی کیوں ہے ——؟

دھرتی سے اتنی اونچائی پر، بادلوں کے سیل گریہ سے محفوظ، زمین کے درد سے ناآشنا چہرے پر ہلدی اور آنکھوں میں آنسو —— انسان کا رونا کہیں ختم بھی ہو گا۔ اب تک میں سمجھتا تھا کہ آنسو صرف میری اور فاطمہ جیسے

مجبور انسانوں کی آنکھوں ہی میں بنتے ہیں اور بہہ نکلتے ہیں اور ان آنسوؤں کا سرچشمہ ایک بھوکی اور ننگی زندگی ہے۔ مگر اس تیسری منزل پر رہنے والی بورژوا اور پیلی لڑکی کے رسیلے چکنے گالوں پر بہتے ہوئے آنسو بتا رہے تھے۔ کہ انسان بہر حال روتا رہے گا چاہے وہ دھرتی پر ہو چاہے تیسری منزل پر چاہے آکاش سے بھی پرے۔ غمِ روزگار نہ ہو گا تو غمِ عشق ہو گا۔ غمِ عشق نہ ہو گا تو کوئی اور غم ہو گا۔

اس لڑکی کے آنسوؤں کو دیکھ کر جی چاہ رہا تھا کہ اُلٹے پاؤں لوٹ جاؤں اور اپنی کمیونسٹ پارٹی کے سکرٹری سے صاف صاف کہہ دوں ... دوستو! میں باز آیا۔ یہ بنگال ریلیف فنڈ وصول کرنے کا کام کسی اور کے سپرد کر دو۔ ابھی ابھی میں ایک تیسری منزل پر رہنے والی لڑکی کے آنکھوں میں آنسو دیکھ آیا ہوں۔ انسان کا مر جانا ہی اچھا ہے۔ وہ زندہ رہے گا تو ہر منزل پہ روتا رہے گا۔ آج ایک غم ہے تو کل دوسرا۔ یہ ریلیف فنڈ نجات کے پیغام کے بجائے رم جھم ... رم جھم برستا ہوا مینہ ہے۔

"بیٹا جی ... ... او بیٹا جی!"

ایک نئی آواز میرے کانوں میں گونجی۔ برسات کی رم جھم ... رم جھم میں محبت کے سوتے سے پھوٹتی ہوئی۔ ایک ماں کے دل سے نکلتی ہوئی یہ آواز میرے کانوں کے لیے غیر مانوس تھی، میری ماں نہ جانے کب مر گئی تھی۔ اس وقت بچپن کے دھندلکے میں میں اس کی صورت بھی نہ دیکھ سکا تھا۔ اور آج برسات کے دھندلکے میں سڑک کے اُس پار ٹین کا شیڈ کے برآمدے

میں وہی چہرہ مجھے نظر آرہا تھا۔ جس کی آواز نے میری رُوح میں دفعتاً ایک بڑی ہی لطیف میٹھی سی چُٹکی لی تھی۔ مجھے عرصے سے ایسی ہی ہستی کی تلاش تھی۔ جس نے مجھے جنم دیا تھا۔ میں اس آغوش میں مُنہ چھپا کر صرف ایک بار ننھے بچّے کی طرح بلک بلک کر رونا چاہتا تھا۔ جتنے آنسو رہ گئے تھے۔ بُوند بُوند بہا دینا چاہتا تھا تاکہ رُوح کی ساری کثافت بہہ جائے اور پھر مر جاؤں۔ میں ایسی ہی کسی آغوش میں مرنا چاہتا ہوں۔

"ارے او بیٹا جی ــــ یہاں آسرا لے لو۔ کیوں بھیگ رہے ہو وہاں"۔

میں اس وقت بالکل بھُول گیا تھا کہ میں بھیگ رہا ہوں۔ اس وقت میں صرف سُن رہا تھا ــ اور سُننا چاہتا تھا۔ میری رُوح کی خلاء میں ایک بالکل ہی نیا نرالا میٹھا نغمہ بج رہا تھا ــــ بیٹا جی! میں نے بیسیوں عورتوں کو گانے گنگناتے باتیں کرتے سُنا ہے مگر ایسا میٹھا بول کبھی نہیں سُنا تھا۔

"اری خورشیداں۔ ذرا تُو ہی پُکار لے شاید وہ میری آواز نہ سُنتا ہو"۔

خورشیداں!! ــــ پھر ایک میٹھی سُریلی آواز آئی۔

"او بھیّا جی ــــ وہاں کیوں بھیگ رہے ہو۔ یہاں کیوں نہیں چلے آتے"۔

ماں اور بہن ــــ واہ ری برسات .. .. دم کے دم میں زمین سے میری ماں اور بہن دونوں کو اُگلوا دیا۔ میرے ہونٹ مُسکرانے لگے اور دل ناچنے لگا۔ اپنی پتلون کے دونوں پائنچوں کو سنبھالتا سڑک کو پار کر کے اس ٹین شیڈ والے برآمدے میں پہنچا۔ بُڑھیا نے بڑی شفقت سے اپنا ہاتھ میرے بھیگے ہوئے بالوں والے سر پر پھیرتے ہوئے کہا۔

بیٹا ---- تم تو بالکل بھیگ گئے قمیص اُتار دو۔ خورشیداں نچوڑ دے گی۔"
خورشیداں کے سامنے قمیص نکالتے مجھے بڑی شرم محسوس ہو رہی تھی مگر یہ میرے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ بارہا ایسے اتفاقات میری زندگی میں لاحق ہوُئے ہیں کہ مجھے شرم محسوس ہوتی اور میں شرم کی پرواہ کرنے پر مجبور ہو جاتا ---- وہ میری پسلیاں گن لے گی تو کیا ہوا۔ میں اس کا دُولھا تو نہیں بننے والا ہوں ---- میں نے قمیض اُتار کر خورشیداں ہی کو دے دی۔ اور پاس رکھے ہوُئے لکڑی کے ایک بوسیدہ صندوق پر بیٹھ کر قلندروں کی طرح بڑھے ہوئے لمبے لمبے بالوں کو جھٹکنے لگا۔ بُڑھیا نے برسات کی دُھند میں نظریں گاڑے ایک تھکی ہوئی بوجھل آواز میں کہنا شروع کیا۔

ستیاناس ہو اس بے وقت کی برسات کا۔ پہلے ہی سے یہ اللہ ماری جنگ ہی کیا کم تھی کہ یہ نگوڑی برسات بھی نازل ہو گئی۔ اب غریبوں کا جینا بھی مشکل ہو گیا ہے دُنیا میں۔"

میں نے سوچا کہ بُڑھیا نے یہ "اب" کا لفظ کیوں استعمال کیا۔ غریبوں کا جینا کب اور کس دَور میں آسان تھا؟ غریبوں کا یہ رونا تو اتنا ہی پُرانا ہے جتنا کہ یہ میرا جُملہ۔

"صبر کرو ماں جی۔ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔"

بُڑھیا بڑبڑائی جیسے زندگی کی کوئی بڑی ہی مُہلک چوٹ کھائی ہو۔

"ہاں بیٹا ---- قبر میں پہنچا کے ہی دم لے گا یہ صبر۔ میرے دو جان جوان بیٹے میری آنکھوں کے آگے اللہ جانے کہاں چھپ

گئے۔ جمعدار نے جانے کیا بہلایا پھسلایا کہ لام پہ بھرتی کر کے بھیج دیا۔ دو سال تک تو خط اور منی آرڈر آتے رہے لیکن اب ادھر چھ مہینے سے نہ کوئی عافیت نہ کیفیت۔ جمعدار ہر مہینہ سات روپلے پنشن دے جاتا ہے مگر مجھے پنشن نہیں چاہیے۔ میرے لال واپس دے دو۔ میری آنکھوں کا نور واپس دے دو۔"

یہ کیسی عجیب آوازیں ہیں —— یہ بوڑھیا آنکھوں کا نور مانگ رہی ہے میری فاطمہ اپنا سہاگ مانگ رہی ہے۔ میں پوچھتا ہوں، آنکھوں کا نور لے کر کیا کرو گی۔ سہاگ مل جانے سے کیا ہو گا؟ میری سُنو مہینے کے مہینے پنشن لے لیا کرو۔ زندہ رہنے کے لیے آنکھوں کے نور اور سہاگ سے زیادہ روپلے کی ضرورت ہے۔ روپیہ ہی سب کچھ ہے۔ میں سچ کہہ رہا ہوں۔ یہ کوئی طنز نہیں۔ یہ کوئی ردِ عمل نہیں اور یہ کوئی تضاد بھی نہیں —— میں اس وقت اپنے آپ سے یہ باتیں کر رہا تھا کہ چوڑیوں کے ہلکے سے دلنواز چھناکے سے میری نظریں اندر کے کمرے کی کھڑکی کی طرف اُٹھیں۔ چار نوجوان چھوکریاں جھانک رہی تھیں۔ سلاخوں سے لگی مسکرا رہی تھیں میں ان مستی بھری آنکھوں کی تمام باتیں سُننا چاہتا تھا۔ ان اجنبی ہونٹوں کی انوکھی دلفریب مسکراہٹ کو سمجھنا چاہتا تھا۔ مگر بڑھیا کی موجودگی جیسے "ریگفریڈ لائٹ" بنی ہوئی تھی۔ میں نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے جیسے اس بڑھیا کے دُکھ سے واقعی متاثر ہو گیا ہوں، پوچھا۔

"کتنے بچے ہیں ماں جی تمھارے —— ؟

بڑھیا نے چونک کر میری طرف دیکھا جیسے میں نے یہ پوچھ کر اس پر کوئی

تہمت لگا دی ہو۔ مگر فوراً ہی سنبھل گئی۔

" دو بیٹے اور پانچ بیٹیاں۔ بیٹوں کی جان کو بیٹھی رو رہی ہوں، چار بیٹیاں چھاتی پر بیٹھی ہیں۔ ایک خورشیداں کا بیاہ کیا تھا۔ پر وہ بھی میری جان پر دھری ہے۔"

خورشیداں بیاہتا ہے ——! یہ ایک بے آواز چیخ تھی جو میری سانس کے ساتھ حلق تک آئی اور پھر آہستہ آہستہ قلب کے سناٹے میں لوٹ گئی۔ اس تھوڑے سے عرصہ میں میں خورشیداں کے بہت قریب تک چلا گیا تھا مگر بڑھیا کے اس جملے نے مجھے دھکے دے دے کر پھر خورشیداں سے دُور کر دیا۔ اب خورشیداں سے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ لیکن میں انتقاماً اس سے دلچسپی لینے لگا۔

"کیا کام کرتا ہے خورشیداں کا شوہر ——؟

بُڑھیا نے کمر میں سے پان کی تھیلی نکالتے ہُوئے جواب دیا:

" یہیں زراعت کے دفتر میں چپراسی ہے۔ پہلے پہل تو خورشیداں بڑے سُکھ سے رہی۔ لیکن اس نے ایک اور عورت کو گھر میں ڈال لیا ہے۔ وہ عورت خورشیداں کو گھر میں ٹکنے ہی نہیں دیتی۔ اب ادھر چار مہینے سے وہ میری ہی چھاتی پر دھری ہے۔ کچھ دنوں تک تو وہ خورشیداں کو دو چار روپے مہینے میں دے جایا کرتا تھا۔ مگر یہ نگوڑا قحط ایسا آن پڑا ہے۔ کہ اس نے مُنہ موڑ لیا۔ خورشیداں کچھ سلائی کا کام کر لیتی تھی۔ لیکن اب تو کفن کے لیے بھی کپڑا نہیں ملتا —— اب ایک فوجیوں کے لیے عمارت بن رہی ہے۔ وہیں بُڑھیا

وہاں گارا پتھر ڈھوتی ہوں۔ کچھ مزدوری مل جاتی ہے ـــ خیر خدا رازق ہے۔"

مجھے حیرت ہوئی۔ اس بڑھیا کو ابھی تک خدا پر اعتقاد ہے۔ بدن پر چیتھڑے، پیٹ میں بھوک، چھاتی پر دھری ہوئیں چار جوانیاں، آنکھوں میں آنسو اور زبان پر نام خدا ـــ دنیا کی دوسری قوموں نے خدا کو اگر اپنے ملکوں سے نکال دیا تو کیا ہوا ہندوستان میں تو خدا کے لیے بہت جگہ ہے۔ ایسے ایسے گنجان جنگلوں اور ویران پہاڑیوں پر مندر اور مسجدیں دیکھی ہیں، جہاں دن میں انسان کو ڈر معلوم ہو۔ میں اس وقت بڑا باغی ہو رہا تھا۔ اسی لیے ذرا تیز لہجے میں اس سے پوچھا۔

پھر تم نے خورشیداں کا دوسرا بیاہ کیوں نہ کر دیا ـــ ؟

بڑھیا اپنی چڑھتی ہوئی سانس روک کر مدھم سی چیخ میں بولی۔

"دوسرا بیاہ ـــ کس کا دوسرا بیاہ۔ ایک شریف لڑکی دوسرا بیاہ کر سکتی ہے ؟"

اس شرافت کے آگے میری بغاوت دھری رہ گئی۔ میں نے اپنے آپ کو ذلیل کرنے کے لیے کہا۔

"معاف کر دو ماں جی ـــ میں بہت بیوقوف ہوں۔ میں یونہیں اوٹ پٹانگ باتیں بک دیا کرتا ہوں۔ تم سچ کہتی ہو۔ بھلا کوئی شریف لڑکی دوسرا بیاہ کر سکتی ہے۔ جہاں لڑکی نے دوسرا بیاہ کیا وہ رذیل ہو گئی۔ وہ تو مرد ہی ہیں جو چار چار بیاہ کے بعد بھی شریف رہتے ہیں۔"

غالباً اس اَن پڑھ بُڑھیا کو بھی یہ کچھ کا چُبھا اور شاید اسی لیے ندامت سے اس کی آواز دبی ہوئی تھی۔

ہاں بیٹا — اب خدا بھیجے خورشیداں کے باپ کو۔ مجھ نصیبوں جلی کو اکیلا چھوڑ کر چل بسے۔ اس سامنے والی کوٹھی کا ایک سہارا تھا وہ بھی اب چھُوٹ گیا۔

سامنے والی کوٹھی — ! ابھی جس کی تیسری منزل پر ایک زرد رُو جوانی گا رہی تھی۔ اُمنڈ اُمنڈ کر میگھا برسے .. میں نے پُرشوق لہجے میں پوچھا۔

"تم نوکر تھیں کیا وہاں ؟"

"ہاں۔ چودہ برس تک اس کوٹھی کا نمک کھایا۔ لیکن کیا معلوم تھا۔ کہ جس نجمہ بی بی نے مجھے رزق دلایا تھا۔ وہی میرے اور میرے بچوں کے پیٹ پر لات ماریں گی۔"

نجمہ بی بی — دھک .. .. دھک دھک۔ میرا دل دھڑکتے ہوئے دفعتاً رُکا اور پھر تیز۔ تیز دھڑکنے لگا۔ خاص خاص لڑکیوں کو دیکھ کر اور ان کا نام اور ان کے تذکرے سُن کر میرے دل کی یہی حالت ہوتی ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ میری خراب صحت ہے۔ جب میں پیپل کے پیڑ کے نیچے کھڑا اس لڑکی کے آنکھوں میں آنسو دیکھ رہا تھا۔ اور اس کا تخریبی گیت کہ اُمنڈ اُمنڈ کر میگھا اتنا برسے کہ زمین سمندروں میں چھُپ جائے۔ اس وقت میں نے ایسا محسوس کیا تھا کہ وہ لڑکی ضرور کسی نہ کسی چھپی ہوئی ٹریجیڈی کی تشنہ کام ہیروئن ہے۔ ورنہ تیسری منزل پر رہنے والی لڑکیوں کے گال تو تازہ ٹماٹروں کی طرح لال ہوتے ہیں۔ میں نے اس بُڑھیا کو اس زرد رُو ہیروئن کے اور قریب لانے کے لیے پوچھا۔

"کون نجمہ بی بی — وہی پیلی پیلی رنگت والی دُبلی پتلی سی لڑکی۔"
بڑھیا نے میری طرف بھنویں سکیڑ کر مشکوک انداز میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔
"تم جانتے ہو بیٹا اس کو — جب وہ چھوٹی سی تھی میرا ہی دودھ پیا تھا اُس نے۔ میں نے ہی اس کو پالا پوسا۔ بے چاری کی ماں اس کے پیدا ہوتے ہی چل بسی تھی۔ سرکار نے دوسری بیگم کر لی تھی۔ اس بچّی کو میں نے اپنی خورشیداں سے زیادہ محبّت سے پالا تھا۔ جوان کیا تھا مگر بڑے گھر کی جوانی کہیں سنبھلتی ہے بیٹا — نجمہ بی بی نے چھُپ چھُپ کر ایک کالج کے لڑکے سے ملنا جُلنا شروع کر دیا۔ میں نے بہت سمجھایا منایا۔ مگر میں ایک ادنیٰ باندی — وہ بھلا میری کیا سُنتی؟"

اتنا کہہ کر بڑھیا چند لمحوں کے لیے کوٹھی کو ٹکٹکی باندھے دیکھنے لگی۔ وہ شاید سوچ رہی تھی کہ وہ بہت بُرا کر رہی ہے جو ایک غیر شخص کے سامنے اس کا راز آشکارا کر رہی ہے جس کا اُس نے نمک کھایا ہے۔ یہ نمک انسان کو بہت کمزور بنا دیتا ہے۔ میں نے ایسے ایسے گرانڈیل انسانوں کو دیکھا ہے جو چھوٹی موٹی جیسے نازک رقیبوں کا مقابلہ نہ کر سکے۔ یعنی نمک حرامی کر ہی نہ سکے۔ مگر میں نمک حرامی کے تخیّل کو بہت فرسودہ سمجھتا ہوں اور چاہتا تھا کہ وہ بڑھیا بھی اس کی قائل نہ رہے — مگر کہانی ادھوری رہی جاتی تھی۔ اور ادھوری کہانیاں مجھے مطلق پسند نہیں۔ اسی لیے میں نے بیتاب ہو کر پوچھا۔

"پھر کیا ہوا —؟"

شکر ہے کہ بڑھیا کی آنکھوں کے آنسوؤں میں وہ سارا کھایا پیا نمک

بہہ نکلا اور اس نے کہنا شروع کیا۔

"ہوتا کیا ——— نجمہ بی بی میرے ہی ہاتھ سے اس لڑکے کے پاس چٹھیاں لکھ لکھ کر بھیجتی تھیں۔ایک دن نئی بیگم نے دیکھ لیا اور ایسی ہی کھڑی برسات مجھے کوٹھی سے کھڑے کھڑے نکال دیا ——— اب تو نجمہ بی بی کی شادی بھی کسی فوج کے افسر سے ہو گئی ہے۔ وہ بیچارا کالج کا لڑکا اب بھی میرے پاس کبھی کبھی آتا ہے اور نجمہ بی بی کو یاد کر کے رو رو کر جاتا ہے۔ دراصل اس لڑکے کا مجھ پر بہت احسان ہے۔ بیٹا۔ جب آتا ہے پانچ دس روپے دے جایا کرتا ہے ——— اناج کا کارڈ بھی اس نے لا دیا۔ یہ اناج کے کارڈ کی بھی عجیب آفت ہے۔ ہم جاہلوں کو کیا معلوم۔ پڑھنا لکھنا تھوڑا ہی آتا ہے۔ کل موئی زہرہ نے وہ کارڈ نہ جانے کہاں کھو دیا۔ دفتر والے سے کہنے گئی تو لگا اُول فول بکنے۔ آج سویرے آیا تھا۔ شام کو دوسرا کارڈ دینے کو کہہ گیا ہے۔ مگر خورشیداں کو ایسی بُری بُری نظروں سے گھور رہا تھا کہ اگر اس کا باپ زندہ ہوتا ... "

بُڑھیا آنسو بہانے لگی اور میں اس کی جھُرّیوں میں اٹک اٹک کر بہتے ہوئے آنسوؤں کو دیکھتے ہوئے سوچنے لگا۔ کہ اگر خورشیداں کا باپ زندہ بھی ہوتا تو وہ دفتر والا اس کو ایسی ہی بُری نظروں سے گھورتا بلکہ کیا عجب ہے کہ اس کی آنکھوں نے خورشیداں کو ہڑپ ہی کر لیا ہو ——— کیونکہ اناج کے کارڈ کے بغیر جیا بھی تو نہیں جاتا۔ اس وقت میرا جی چاہ رہا تھا کہ دوڑ کر سرکاری مہمان خانے جاؤں اور

وہاں چینی وفد کے جتنے اراکین ٹھہرے ہیں۔ انھیں اس بڑھیا کے گھر لے آؤں کہ دیکھو ــــ یہ ہے ہندوستان! تاج محل۔ قطب مینار، جامعہ عثمانیہ، ایلورہ اور اجنتا کیا دیکھتے ہو۔ اس بڑھیا کا یہ ٹین شیڈ دیکھو اور پھر یہاں سے سیدھے چین لوٹ جاؤ ــــ یہاں اور پھر کوئی چیز دیکھنے کی نہیں ہے۔

رم جھم ... رم جھم۔ بارش دھیمی پڑنے لگی اور بڑھیا نے چونک کر کہا۔

"ارے برسات دھیمی ہو رہی ہے۔"

بڑھیا یہ جملہ کہتے ہوئے کچھ ایسی گھبرائی ہوئی تھی۔ جیسے برسات کا پڑنا اور دھیما ہونا دونوں اس کے لیے آفتیں ہیں۔ میں نے اس کی اس گھبراہٹ کو تغریباً غور سے دیکھنا چاہا۔ لیکن بڑھیا کی پلکیں جھک گئیں۔ اور اس نے سر جھکائے دبی دبی زبان میں کہنا شروع کیا۔

"بیٹا ــــ اگر تم سے کچھ ہو سکے تو ہماری کچھ مدد کر دو ــــ وہاں ــــ خورشیداں ــــ کمرے میں قمیص لیے تمھارا انتظار ..."

میرے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ یہ ماں کہہ رہی ہے ــــ خیر کوئی انوکھی بات نہیں۔ انوکھی بات صرف اتنی ہے کہ میرے جسم پر رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میری جیب میں اس وقت بنگال ریلیف فنڈ کے پانچ روپے تھے جو مس باٹلی والا سے میں نے وصول کیے تھے۔ اس میں سے عمداً ایک ہی روپیہ نکال کر میں نے اس بڑھیا کی طرف پھینکا۔ اور دنیا کے سب سے بڑے محسنِ انسانیت کی طرح کہنے لگا۔

"ماں ــــ تم میری ماں ہو اور میں خورشیداں کو اپنی بہن سمجھتا ہوں۔"

ابھی برسات پُوری طرح نہ رُکی تھی۔ مگر مجھے اس جگہ سے اب کچھ ایسی وحشت سی ہونے لگی تھی کہ پانچ جوان چھوکریوں کی موجودگی اور چُوڑیوں کے دلآویز چھناکوں کے باوجود میں وہاں سے اُٹھا اور بھیگتا ٹھٹھرتا تیز تیز قدم اٹھاتا نیشنلسٹ ورکرز ایسوسی ایشن کی طرف چلا۔ جوں ہی میں نے دہلیز میں قدم رکھا۔ نوح نے دوڑ کر مجھے گلے سے لگا لیا۔ وہ کسی مسرّت سے جیسے وارفتہ ہو رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور ہونٹوں پر ہنسی۔ میں نے اُس کی سخت باہوں سے اپنے آپ کو چھڑاتے ہوئے مذاقاً کہا۔

"دوست —— شاید تمھیں جیل ہوگئی ہے اسی لیے بڑے خوش خوش نظر آرہے ہو۔"

"یار —— سوہن سنگھ بولا۔ تُو نہیں جانتا۔ اس کی کوئی محبوبہ ہے —— نجمہ! وہ بنگال ریلیف فنڈ کی خاطر سٹی گرلز اسکول کے اسٹیج پر اپنے رقص اور موسیقی کا مظاہرہ کرے گی۔"

"نج —— مہ" میں رُکتے رُکتے بولا۔ اور سمجھ گیا کہ یہی ہے وہ اُمنڈ اُمنڈ کر میگھا برسے" والی کا عاشقِ ناکام۔ میز پر بیٹھتے ہوئے ایک سگریٹ جلا کر میں نے کہا۔

اس میں کوئی شک نہیں۔ کہ ہمارے پیشِ نظر زندگی کا ایک صحیح نصب العین ہے مگر اس نصب العین تک پہنچنے کے لیے ہم نے جو راستے بنائے ہیں۔ وہ بڑے دُور کے راستے ہیں۔ میں کہتا ہوں۔ کہ بنگال اب سارے ہندوستان میں پھیل گیا ہے۔ ابھی ابھی میں بنگال سے آرہا ہوں۔ میں نے حیدرآباد میں بھی بنگال دیکھا ہے۔"

نوح نے حیرت سے پوچھا۔

کیا بک رہے ہو۔ بارش میں بھیگنے سے دماغ کے کل پُرزے تو خراب نہیں ہو گئے کہیں —؟

میں نے معنی خیز نظروں سے نوح کو ایک لمحہ کے لیے دیکھا اور ہلکا سا طنز پیدا کرتے ہوئے جواب دیا۔

"دوست — تم بھی اس کو دیکھ چکے ہو۔ تمہاری ہیروئن نجمہ کی کوٹھی کے سامنے جو ٹین شیڈ ہے۔ کیا وہ بنگال نہیں ہے۔ وہاں ایک بُڑھیا — اس کی پانچ نوجوان لڑکیاں — چاندی کے ایک سکّے کے لیے — اناج کے کارڈ کے لیے، ستر ڈھانکنے کے لیے اپنی زندگیاں بیچ رہی ہیں۔ اس لیے میں نے باُمید منظوری مس باٹلی والا کے چندے میں سے ایک روپیہ اُنہیں دے دیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ہماری ایسوسی ایشن میرے اس فعل کو بڑی مستحسن نظروں سے دیکھے گی۔"

نوح نے غضب ناک نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ایسوسی ایشن تمہارے فعل پر ملامت کرتی ہے۔ تم نے خورشیداں کی بے بسی سے ناجائز فائدہ اُٹھایا ہے۔ کل تک مس باٹلی والا کا روپیہ جمع ہو جانا چاہیے۔"

پہلے پہل تو میں گھبرا گیا لیکن بعد کو سنبھل کر جواب دیا۔

"نوح صاحب — آپ کا خیال غلط ہے۔ ممکن ہے، آپ خورشیداں کی بے بسی سے ناجائز فائدہ اُٹھاتے ہوں۔ لیکن میں

خورشیداں کو اپنی بہن سمجھتا ہوں۔"

نوح نے کسی خاص دُکھ سے متاثر ہو کر کہا۔

"جی ہاں — جی ہاں — مگر کل تک مِس باٹلی والا کا روپیہ جمع ہو جانا چاہیے۔ ایسوسی ایشن کا یہی فیصلہ ہے؟

سوہن سنگھ، ظہیر، ساہنی، وزیر محمد سب چُپ تھے۔ میں میز پر سے آہستہ سے اُترا۔ نوح کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے مسکراتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

راستے بھر مجھے رہ رہ کر اپنے آپ پر غصّہ آ رہا تھا۔ کہ میں نے خورشیداں کو بہن کیوں کہہ دیا — ؟

زرد چہرے

آصف کی بہن جوان تھی اور پانچ سال سے اپنے دُولہا کا انتظار کر رہی تھی۔ نہ جانے اس کا دُولہا کون تھا۔ کیسا تھا۔ کہاں کا رہنے والا تھا اور کب آنے والا تھا۔۔! آصف کو کچھ ایسا محسوس ہوتا کہ جب تک اس کی بہن کے رخساروں پر گیندے کے پیلے پیلے پھُول کھِلے ہیں۔ اس کا دُولہا کبھی نہ آئے گا۔ کیونکہ دُولھے گیندے کے پھُولوں کو مطلق پسند نہیں کرتے وہ تو گلاب کے سُرخ سُرخ پھولوں پر جان دیتے ہیں۔ اس کی سہیلیوں ہاجرہ، پردتما، زہرہ، شیلا اور سعیدہ کے گالوں میں کتنے بڑے بڑے سُرخ گلاب تھے۔ اور اُن کے دُولھے کتنی جلدی، کتنے اضطراب اور کتنی بےتابی سے آ آ کر اِن سُرخ سُرخ پھُولوں کو توڑ توڑ کر لے گئے۔ اب سارے محلّے میں صرف ایک ہی پھُول رہ گیا تھا۔۔۔ گیندے کا پیلا پیلا پھُول۔۔۔ اس کی بہن جو پُورے پانچ سال سے خوابوں میں، تصوّر میں، خلاؤں میں اپنے

دولھا کو دیکھ رہی تھی۔ ممکن ہے خوابوں میں اس کا دُولھا دکھائی دیتا ہو۔ تصوّر میں چلا آتا ہو اور خلاؤں میں اس کی طرف بڑھتا ہو ۔۔ لیکن وہ تو دھرتی پر رہتی تھی خوابوں، خلاؤں اور تصوّر میں آنے والے دولھے دھرتی پر کیسے اُتر سکتے ہیں وہ تو خوابوں کی نرم نرم سطح پر ہی چل پھر سکتے ہیں۔ دھرتی تو ان کے لئے بڑی سخت کھُردری اور پتھریلی ہوتی ہے۔

سارے محلّے میں مشہور تھا کہ اس کی بہن کو دق ہو گئی ہے۔ لیکن شہر کے بڑے بڑے ڈاکٹروں نے بتایا تھا کہ دِق وِق کچھ بھی نہیں۔ صرف ایک مرض ہے ۔۔ طویل کنوارپن۔ جو بہت ممکن ہے طویل ہوتے ہوتے دق کے گلے میں بھی بانہیں ڈال دے۔ جوں جوں اس کی بہن کا کنوارپن لمبا ہوتا جاتا تھا۔ وہ بھی اس کی فکر میں گھُل گھُل کر سُوکھ سُوکھ کر لمبا ہوتا جا رہا تھا ———— ہڈیوں کا لمبا سی لمبا ڈھانچہ۔

بہن کی مانگ میں افشاں چُننے کے لیے اس نے کیا کچھ نہ کیا۔ جب باپ بغیر کسی بیماری کے اچانک مر گیا تو اس نے قانون کی تعلیم ادھوری چھوڑ کر تیس روپیہ ماہوار کی کلرکی جیسی ادنیٰ غلامی بھی چار و ناچار قبول کر لی۔ اگر اس کی بہن نہ ہوتی یا جوان نہ ہوتی یا وہ مفلس نہ ہوتا تو اپنے مشہور قوم پرست باپ کی طرح وکالت یا کوئی دوسرا آزاد پیشہ اختیار کرتا۔ دفتری غلامی کبھی نہ کرتا۔ اپنی رگوں میں دوڑتے ہوئے آزاد منش باپ کے لہُو کی توہین نہ کرتا۔ اس کی طرح خود بھی حکومت سے ٹکریں لیتا رہتا۔ لیکن جس کا باپ مر گیا ہو جس کی آمدنی تیس روپیہ ماہوار ہو۔ جس کی بہن کنواری ہو اور جس کے بہن کے رخساروں پر گینڈے

کے زرد زرد پھول کھلے ہوں۔ وہ کیا حکومت سے ٹکر لے سکتا ہے۔ وہ کیا دفتر سے جیت سکتا ہے۔

مگر اس کی بہن تو ابھی عورت بننے سے پہلے معمہ بن گئی تھی۔ وہ بیچارا تو اس کے لیے صبح سے شام تک دفتر کی میز پہ جھکا رہتا۔ صاحبوں کی جھڑکیاں سنتا اور مہینے کے مہینے تیس روپے اپنی بہن کی ہتھیلی میں رکھ دیتا۔ اور اس کے باوجود اس کے ہونٹوں پہ ایک مبہم سی مسکراہٹ تک نہ آتی۔ اس کے پیلے پیلے گالوں میں لہو کی ایک مدھم سی دھار ــــ ایک ہلکی سی شہابی لَو تک نہ رینگتی۔ اس بات پر وہ جھلا اٹھتا اور بات بے بات اس کو جھڑک دیتا۔ لیکن جب پیلے پیلے پھولوں پہ شبنم کی بوندیں رینگنے لگتیں تو وہ ان بھیگے ہوئے پھولوں کو اپنے میلے ڈیر کوٹ کے لمبے لمبے کالروں میں چھپا کر خود بھی رونے لگتا ــــ کیونکہ شبنم کی بوندوں سے دھل کر ان پھولوں کی زردی خطرناک حد تک نکھر جاتی۔

مگر وہ مایوس نہیں تھا۔ اس کو یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن وہ اپنی بہن کے دولھا کو خوابوں، تصوّرات اور خلاؤں سے گھسیٹ کر اسی دھرتی پر لے آئے گا کیونکہ دولھے بڑے لالچی ہوتے ہیں۔ پھول خواہ کتنا ہی معمولی اور پیلا کیوں نہ ہو۔ اگر اس کو سونے اور چاندی کے گلدان میں رکھ کر پیش کرو تو دولھا آنکھ بند کر کے وہ گلدان لے لیتے ہیں ــــ اسی لیے وہ کلرکی کے علاوہ اخباروں اور رسالوں کے دفاتر میں بھی آدھی آدھی رات تک کام کرنے لگا۔ اس کی آمدنی بڑھنے لگی۔ پچاس روپیہ۔ ساٹھ روپیہ۔ سترّ روپیہ۔

صبح بالوں میں کنگھا کرتے وقت وہ آئینے میں اپنی صورت دیکھتا کہ آدھی

آدھی رات تک کام کرنے سے اس کے اپنے گالوں کے سرخ ڈورے مدھم پڑ رہے ہیں لیکن اب اس کو ان سرخ ڈوروں کی ضرورت ہی کیا تھی۔ وہ تو چاہتا تھا کہ یہی سرخ ڈورے اس کی بہن کے رخساروں میں داخل ہو جائیں اور بس۔ اور اگر یہ نہیں ہو سکا۔ تو وہ اپنی بہن کو سونے اور چاندی کے جگمگ جگمگ کرتے زیوروں سے ایسا سجائے گا کہ ہاجرہ، ہردتما، زہرہ، شیلا اور سعیدہ کے دولھوں کی آنکھیں چندھیا جائیں گی۔ وہ اپنے بے مصرف، فضول مسکرانے والے سرخ گالوں سے متنفر ہو جائیں گے۔ اور جب شہر کی سڑکوں پر سے دولھا اس کی بہن کے گلے میں پڑے ہوئے جڑاؤ ہار کو پکڑے، اس کو باجوں، ڈھولوں اور تاشوں کے شور اور گیس لیمپوں کی سپید چمکدار روشنی میں فاتحانہ انداز میں کھینچے لیے جائے گا۔ تو وہ ہاتھ مل مل کر اپنی جلد بازی اپنی بے وقوفی اور اپنی حماقت پر پچھتاتے رہیں گے۔

جس مہینے اس کی آمدنی پچاسی روپے ہو گئی۔ اس کے گالوں کی شفق بالکل ہی ڈوب گئی۔ اب اس کے چہرے کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کسی زرد رنگ کے شیشوں والی کھڑکی سے منعکس ہوتی ہوئی روشنی میں کھڑا ہے اس کے دوست احباب جب اس کے پیلے مرجھائے ہوئے چہرے کو دیکھتے تو کڑوا کڑوا مذاق کرتے۔

"علاج کراؤ اپنا۔ کوئی لڑکی تم سے شادی کرنا پسند نہ کرے گی۔"

"جوانی ساری عورت بغیر ہی گزر جائے گی۔"

وہ مسکرا دیتا۔ اب اس کے ہونٹ بہت مسکرانے لگے تھے۔ بار بار مسکراتے تھے۔

ایک مہینے میں اس کو پچاسی روپے ملتے تھے۔ اور وہ پچاسی دفعہ مُسکراتا تھا۔

"ارے کوئی لڑکی شادی نہ کرے۔ اس کی بَلا سے۔ جوانی صرف عورت کے آغوش میں گزار دینے کے لیے تو نہیں ہے۔ جوانی حُجلہ عرُوسی، اور عورت کی خلوتوں میں بسر کرنے کے لیے تو عطا نہیں ہوئی۔ جوانی تو الف لیلیٰ کے شُورماؤں کی طرح اتال پتال چھاننے کے لیے ہے۔"

اور پھر بقیہّ جملے وہ اپنے دل ہی دل میں چُپکے چپکے کہتا۔

"جوانی زندگی سے لڑنے کے لیے ہے۔ اپنی جوان بہنوں کی مانگ میں سہاگ کی افشاں بھرنے کے لیے ہے۔ ان کے شرمیلے، لالچی رنگ و بُو پر جان دینے والے دُولہاؤں کو آسمان سے دھرتی پر گھسیٹ لانے کے لیے ہے —— میں جو اپنی بہن کا حُجلۂ عروسی بناؤں گا۔ وہ تاج محل سے زیادہ شاندار ہو گا۔"

چند ہی مہینوں بعد وہ سَو سَو اور سَوا سو روپے ایک ایک مہینے میں کمانے لگا۔ صحت دن بدن گرتی جا رہی تھی۔ جان عزیز رونے بسورنے لگی تھی۔ لیکن وہ اندھا دُھند دن کے اُجالے اور رات کے اندھیرے میں روپوں کے پیچھے دوڑتا رہا۔

اپنی نیندیں، اپنے تصوّر کے جزیرے اپنے سپنے اور اپنی جوانی —— یعنی برجیس جہاں کو بھی بھُول گیا۔ اس کی برجیس جہاں جس سے اس کو ایک دبی دبی ڈھکی چھپی اور چور محبّت تھی —— جس کی بڑی بڑی آنکھوں سے نکلے ہوئے تیروں نے اس کے ننّھے سے دل میں بیشمار آنکھیں پیدا کر دی تھیں۔

ایک دن وہ بہت تھکا ہارا گھر لوٹا۔ اور چارپائی پر گر کر بُری طرح کھانسنے لگا۔

اس کی بہن نے اس کے جوتے کے تسمے کھولے۔ اس کا میلا دبیز کوٹ نکالا اور اس کے سرہانے بیٹھ کر نیلگری کے تیل سے اس کے سینے کی مالش کرنے لگی۔ اس نے مسکراتی ہوئی آنکھوں سے اپنی بے زبان، مجبور بہن کے پیلے پیلے، افسردگی سے کملائے ہوئے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"میری اچھی گڑیا ـــ باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا تو کیا ہُوا میں اب اپنے سائے میں تیرے ہاتھوں کو ایسی لال لال مہندی سے رنگ دوں گا۔ کہ تو۔۔ ہاں تو جا اسی بات پر میرے لیے اچھی سی چائے بنا لا۔"

بہن ایک حزیں مسکراہٹ سے مُنہ چھپا کر چلی گئی۔ اپنے بھائی کی یہ حالت دیکھ کر اپنے ہاتھوں کو مہندی سے رنگا دیکھنے سے بالکل ہی مایوس ہو گئی تھی۔

مسرت کے موقع پر عقل کہاں چلی جاتی ہے۔ وہ اپنے سائے کا اپنے باپ کے سائے سے مقابلہ کر رہا تھا۔ اس کا باپ تو کھاتے پیتے پرانے ہندوستان کا ایک بھاری بھرکم انسان تھا۔ چھ فٹ لمبا تین فٹ چوڑا۔ اور اس کی آمدنی بیٹے کی آمدنی سے چھ گُنی زیادہ تھی۔ اس کے سائے میں تو اٹھارہ انسانوں کا ایک خاندان پل رہا تھا۔ کئی غریب رشتہ دار عورتوں کے مانگوں میں سہاگ کی افشاں چُنی گئی تھی۔ ـــ اب یہ ڈینگیں مارنے والا ہڈیوں کا لمبا ہی لمبا ڈھچر۔ میلا دبیز کوٹ اُتار دینے پر اس کا سایہ ٹیلیفون کے کھمبے کی طرح اتنا پتلا اور مُنحنی تھا۔ کہ ایک ہی دُبلی پتلی نرم و نازک بہن جوانی کی دھوپ اور حدت سے نہیں بچتی تھی۔ وہ تو اس دھوپ میں جیسے جل رہی تھی۔ اُبل رہی تھی۔ بالکل اس دیگچی کی طرح جس میں پکتے ہوئے چائے کے پانی کو اُبال آ رہا ہو ـــ ہاں جب وہ روپیوں سے پھولی

ہوئی جیبوں والا ڈبیز کوٹ پہن لیتی تو اس کے بڑے بڑے کالروں میں مُنہ
چھپا کر جوانی، حدّت، دھوپ سبھی کچھ بھول جاتی تھی۔
بھائی کی دن بدن گرتی ہوئی صحت اور سوکھتے ہوئے جسم کو دیکھ کر بہن نے
آخر جی کڑا کر کے شرم کی کینچلی اُتار کر جھجکتے ہوئے ایک دن کہہ دیا۔
"بھیّا — آپ کی زندگی سے میری زندگی ہے۔ آپ پر سے میری جیسی ہزار
بہنیں وار کر کے پھینکی جا سکتی ہیں۔ آپ میرے لیے کیوں اپنی زندگی
اپنی جوانی اس طرح برباد کر رہے ہیں۔ مجھے آپ جیسے پیارے بھائی کے
قدموں میں بڑی آرام اور چین کی زندگی حاصل ہے — میں کہیں اور
جانا نہیں چاہتی۔ میں .. میں شادی بھی نہیں کرنا چاہتی —
ہاں آپ شادی کر لیجیئے۔ گلاب کے پھول جیسی بھابی بیاہ لائیے۔ میں آپ
دونوں کی خدمت میں ہنستے مسکراتے زندگی گزار دوں گی۔ بھی آپ
دونوں کے ہوتے ہوئے مجھے شادی کی کیا ضرورت ہے۔"
اس نے بہن کے آنسوؤں سے بھیگے ہوئے گالوں پر محبّت کی لطافت سے
گدگدایا ہوا ایک نرم طمانچہ لگاتے ہوئے کہا۔
"پگلی — میں جانتا ہوں کہ تو اتنی پیلی ہے کہ تیرے جسم میں لہو کی بہت
تھوڑی بوندیں ہیں۔ ان بوندوں میں کبھی تلاطم پیدا نہ ہوگا۔ تو چاہے
یا نہ چاہے لیکن دُنیا اور دُنیا والوں کے لیے تیری شادی کرنا بہت
ضروری ہے۔ ورنہ اگر تو مصلّے پر بیٹھ کر بھی قسم کھائے تو بھی کوئی
تیری پاک دامنی کا یقین نہ کرے گا۔"

اس نے بھی جی کڑا کر کے شرم کو بالائے طاق رکھ کے کہہ دیا۔ اس وقت اس کے جی میں آئی کہ یہ بھی کہہ دے "تو جھوٹی ہے۔ تجھے شادی کی ضرورت ہے۔ میں خود ہر رات تیری چارپائی سے اُبلتی ہوئی دبی دبی بھیانک آہیں سُنتا ہوں۔ بیشمار کروٹوں سے چرچراتی ہوئی چارپائی سے تیری پیاسی جوانی کی چیخیں سنتا ہوں۔ مجھے دھوکہ دینے کی کوشش نہ کر۔ تُو نے صرف یہ گھر کی چاردیواری دیکھی۔ مگر میں نے تو بہت بڑی دُنیا دیکھی ہے۔ اٹھائیسویں برس میں سر میں سپید بال، گردن میں جھکاؤ۔ اور آنکھوں میں یاسیّت کا دُھندلکا ـــ یہ کیا ہے؟ میں نے دُنیا دیکھی ہے۔ تُو تو صرف چوبیس برس کی ایک کنواری ہے۔

☙ ☙ ☙

پھر اس کی زندگی میں ایک بڑا ہی چمکیلا دن طلوع ہوُا۔ اپنی بہن کو سر سے پاؤں تک سونے اور چاندی کے زیورات سے جگمگا دیا۔ اس کی مانگ کو کہکشاں سے زیادہ چمکیلا بنا کر سنوارا۔ اس کی ہتھیلیوں میں ایسی سُرخ سُرخ مہندی لگائی کہ شفق تک شرما کر پہاڑیوں کے پیچھے چھپ گئی۔ سبز رنگ کی سلمہ ستارا ٹنکی ہوئی بنارسی ساڑھی اور سونے کے پیلے پیلے چمکتے زیور۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے سبز رنگ کے گلدان پر پُرانے ہندوستان کے کسی مشہور نقّاش نے بڑے فن کارانہ انداز سے منبت کاری کی ہو۔ اور اس میں گیندے کا ایک پیلا پیلا پھول شرما رہا ہو ـــ اس پھُول کی پتیاں شبنم کی لاتعداد بوندوں سے بھیگ رہی تھیں۔ وہ خود بھی روتا ہوُا مصنوعی خوشی سے مُسکراتے ہوُے اس کی پیٹھ تھپکتے ہوُے دلاسا دے رہا تھا۔ ارے ـــ دُلھنیں روتی ہیں ـــ کہیں روتی ہیں ـــ؟ ہُونہہ!

اور تاشوں نفیریوں، ڈھولوں کا شور فضاؤں میں بلند ہو ہو کر اس پر ٹھٹے لگا رہا تھا کہ دیکھو —— یہ آنسو پونچھنے والا خود بھی تو آنسو بہا رہا ہے۔ ہاہاہا —— ڈھم ڈھم۔ پیں پیں۔ پیں پیں۔ تر ر رت۔ تر ر تر ر ...

٭ ٭ ٭

بہن کے چلے جانے کے بعد اس کی زندگی اس کا گھر سبھی سنسان پڑ گیا تھا۔ اس کی بہن کی چارپائی اب چپ چاپ اکیلی پڑی رہتی۔ وہ اب آہیں نہیں بھرتی تھی اور نہ اس سے کسی پیاسی جوانی کی چرچراتی ہوئی چیخیں سنائی دیتی تھیں۔ وہ اب ہوٹلوں میں کھانا کھا رہا تھا۔ کسی دیگچی میں اُبال ہی نہ آتا تھا۔ مگر ہاں اس کی گردن اب پھر سے اونچی ہو گئی تھی۔ کتنے سال سے اس کی بہن کی وزنی جوانی اس کے گلے میں بانہیں ڈالے جھول رہی تھی۔ اب تو بوجھ اُتر گیا تھا۔ وہ فخر سے گردن اُٹھا کر سڑکوں پر چلتا تھا۔ بات بات پر گردن پیچھے پھینک کر قہقہے لگاتا تھا۔ کتنے عرصے سے اس کے قہقہے اس کے حلق میں رُکے ہوئے تھے محفوظ تھے۔ اب وہ شاذ و نادر ہی زمین کی طرف دیکھتا۔ اب اس کو زمین کی طرف دیکھنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ جتنا سونا چاندی اور روپیہ پیسہ اس کی بہن کی شادی کے لیے ضروری تھا۔ اس نے زمین کے حلق میں اُنگلی ڈال کر سب اُگلوا لیا تھا۔

اب وہ دن میں ایک بار ضرور اپنی بہن کو دیکھنے اس کی سسرال چلا جاتا۔ اور نہایت مسرور گھر لوٹتا کہ بہن کے گالوں میں گلاب کی سُرخ سُرخ کلیاں نمودار ہو رہی ہیں۔ آج کل یا پرسوں یہ کلیاں کھل کر بوٹے بڑے لال لال

پھول بن جائیں گی۔ اور اس کا دولہا ان پھولوں کے گرد مست، مخمور اور مسرور بھنورے کی طرح منڈلایا کرے گا۔ اس مزیدار خیال سے خوش ہو کر سگریٹ کا ایک لمبا کش لیتے ہوئے وہ آسمان کی طرف دیکھ کر مسکرا دیتا جیسے وہ تنہا فاتح ہے۔ جسے نہ آسمان شکست دے سکا۔ اور نہ زندگی۔ البتہ اس کو ساری زندگی میں صرف ایک دکھ تھا کہ وہ برجیس جہاں کو اپنا نہ بنا سکا۔ اگرچہ کہ برجیس جہاں ابھی تک کنواری تھی لیکن اس کا کنوارپن ایک ٹروفی تھا جس کو جیتنے کے لیے چند خاص خاص شرائط مقرر تھے۔ آصف نے برجیس جہاں کے باپ کو اس کے بے تکلف دوستوں اور عزیزوں سے کہلوا بھیجا کہ وہ برجیس سے محبّت کرتا ہے۔ برجیس کے باپ نے جواب دیا کہ شادی کے لیے محبّت اتنی اہم نہیں۔ بیوی کو اچھا مکان، اچھی غذا، اچھے کپڑے زیادہ ضروری ہیں ۔۔۔ آصف کے رقیب نیلام کی بولی لگا رہے تھے۔

"میرے تین مکانات ہیں۔ وہ تینوں برجیس کے نام لکھ دوں گا۔"

"میری آمدنی چار سو روپیہ ماہانہ ہے۔"

"میری جواہرات کی دوکان ہے۔ برجیس ساری عمر جگمگاتی رہے گی۔"

"میری دو موٹریں ہیں۔ برجیس کو دنیا جہاں کی سیر کراؤں گا۔"

"میری پنشن پندرہ سو روپیہ ماہانہ ہے۔ میں برجیس کو کشمیر کی جنّت میں لے جاؤں گا۔"

آصف ہار گیا۔ اسی کے دفتر میں ہیڈ کلرک نے وہ ٹروفی جیت لی۔ آصف کی جانِ تمنّا جیت لی۔

محبوبہ کے چھن جانے کے بعد آصف کو کسی دوسری محبوبہ کی ضرورت نہیں تھی۔ البتہ اس کی جوانی کے خلاء میں اس کو اتنا سناٹا، سکوت اور ڈر محسوس ہوتا کہ اس کا جی چاہتا کہ اس مہیب سناٹے میں دفعتاً کانچ کی چوڑیاں بجنے لگیں۔ پازیب کی ہلکی ہلکی جھنکار پیدا ہو۔ دوپٹے سرسرانے لگیں۔ بھر بھر۔ بھر رَاپ بھر —— محبوبہ نہیں سہی کوئی عورت ہی سہی جو اس کی زندگی میں مہمان کی طرح ہی کیوں نہ آئے۔

اور جلد ہی ایک عورت اُسے مِل گئی۔ شہر میں عیسائیت کی تبلیغ کرنے کے لیے ایک مشن آیا ہوا تھا۔ اس میں بہت سی لال پریاں تھیں۔ ان کے جسم جیسے سپید سپید شیشوں سے بنائے گئے تھے۔ اور اندر گہرا سُرخ رنگ بھر دیا گیا تھا۔ ہندوستان کے بھوکوں اور ننگوں کی جان میں جان آئی۔ وہ اپنے اپنے ویران راستوں جیسے مذاہب کو چھوڑ کر اس شاہراہ پر چلنے لگے۔ جہاں قدم قدم پر ہوٹلیں اور سرائیں لگی ہوئی تھیں۔ کھانا پینا —— روپیہ پیسہ۔ عورتیں۔ آصف کو ان نعمتوں میں صرف ایک ہی نعمت چاہیے تھی ...... مِس فاکس۔

واللہ کیا عورت تھی مس فاکس! پہلی بار آصف نے اس کو امپیریل پوسٹ آفس سے نکلتے دیکھا تھا۔ بھر بھرا جسم لمبا قد۔ اور اس کے مصوّر نے اس کو رنگنے میں جیسے سارا گلابی رنگ صرف کر دیا تھا۔ اس کے گالوں پر میٹھے سیبوں کے بجائے پارک شائر کے کسیلے ٹماٹر تھے۔ پوسٹ آفس سے نکل کر جب وہ اپنی سائیکل پر چڑھ رہی تھی تو اس کی پنڈلیوں کی تھرکتی ہوئی

لال لال مچھلیوں کو دیکھ کر اس نے ایسا محسوس کیا۔ جیسے وہ زندہ ہے وہ مر گیا ہے۔ وہ مر گیا ہے۔ وہ زندہ ہے ...... ""

اس نے قومی نسلی تعصّب کو دل ہی دل میں دھتکار بتائی اور ایک صاف دل سے اعتراف کرنے لگا۔ کہ واقعی دُنیا کے دوسرے مُلکوں نے عورت کی اصلی قدر جانی پہچانی ہے۔ یہاں ہندوستان میں تو عورت کی مٹّی پلید ہو گئی۔ اس مٹّی کو تو صرف گیندے، زعفران، بنفشے اور سورج مکھی کے پھُول ہی اُگانے آتے ہیں۔

دوسرے تیسرے ہی دن اس نے مس فاکس سے راہ رسم بڑھالی اور جوانی پھر پھوٹ آئی۔ وہ اب اپنی بہن کو بہت کم یاد کرنے لگا۔ گلاب کا پھُول سامنے ہو تو گیندا کہاں یاد آتا ہے؟

ایک دن مس فاکس آرکسٹرا پر ایک المیہ فراقیہ گیت الاپ رہی تھی اور آصف اس شاعر کو جس نے ایسا گیت لکھا۔ دل ہی دل میں کوستا ہُوا چُپ چاپ سُن رہا تھا کہ اچانک اس کو گیندے کا پھول یاد آگیا۔ کیونکہ دروازے سے اس کی بہن کا لالچی شوہر داخل ہُوا۔ اور پھر آصف کو دیکھ کر ٹھٹکا۔ رُکا، جھجکا۔ لیکن جب مس فاکس مُسکراتے ہُوئے اُس کو بُلانے لگی تو آصف صوفہ سے اُٹھ کھڑا ہُوا۔ مس فاکس آصف کے بدلتے تیور دیکھ کر ہنس پڑی۔ یعنی" ...... وہ تو روز یہاں آتا ہے۔"

اسی شام وہ اپنی بہن کے گھر گیا۔ اس نے اس سے ایک لفظ نہ پوچھا۔ سگریٹ پیتا رہا۔ اور اس کے بھنچے ہوئے ہونٹ جو بار بار ہلکی سی کپکپاہٹ

سے کھل جاتے تھے۔ اس کی جھکی جھکی پلکیں اور پلکوں کی گھنیری چھاؤں میں کانپتے ہوئے تارے دیکھے۔ ابھی کچھ ہی دن پہلے انہی گالوں پہ اُس نے سُرخ سُرخ لکیروں کا ایک جال بنتے دیکھا تھا۔ آج وہ جال ...... اُونہہ! عورت کا رنگ بھی کیسا تغیر پذیر، کیسا بے اعتبار، کیسا ناپائدار اور کیسا عارضی ہوتا ہے۔

جب وہ گھر پہنچا تو اس کا دماغ ایک دم ساکت ہو گیا تھا۔ اس کو اب کچھ بھی محسوس نہیں ہوتا تھا کہ وہ ہنس رہا ہے تو کیوں ہنس رہا ہے۔ رو رہا ہے تو کیوں رو رہا ہے۔ اب شاید اس احساس کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ زندگی نے اس کے ہڈیاں نکلے ہوئے سینہ پہ ایسا زبردست گھونسہ لگایا تھا۔ کہ وہ تین دن تک چارپائی سے نہ اُٹھ سکا۔ کھانستا رہا۔ بال نوچ نوچ کر روتا رہا۔ کبھی ہنستا رہا۔ کبھی گاتا رہا۔ اور چوتھے دن جانے کیا اس کے جی میں سمائی۔ اپنا پُرانا رفیق وہی میلا دبیز کوٹ پہنے باہر نکلا۔ اس کی آنکھوں میں سُرخ سُرخ شعلے لپک رہے تھے۔ جیسے کسی کو جھلس ہی دیں گے۔

چینی ریستوران کے چوراہے پر نکھری ہوئی شام اپنا سپید بھیگا ہوا دوپٹہ پھیلائے کھڑی تھی۔ وہ بس اسٹاپ کے ستون سے کندھا ٹیکے سگریٹ کے دھوئیں کے مرغولے بنا بنا کر توڑ رہا تھا۔ اور ہر آنے جانے والے کو دیکھ دیکھ کر مُسکرا رہا تھا — ایک بھاری بھرکم پنجابی عورت کو اپنے دُبلے پتلے مُنحنی پستہ قد شوہر کے ساتھ جھُک جھُک کر باتیں کرتا دیکھ کر تو وہ بڑے زور سے ہنس پڑا۔ پنجابی عورت خشمگیں نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے اپنے

شوہر کا غصّہ رفع کرنے لگی —— کوئی پاگل معلوم ہوتا ہے۔ ہوں۔"
وہ اُن کے قریب جا کر کہنے لگا۔

"نہیں نہیں —— میں پاگل نہیں ہوں۔ پاگل تو گاندھی ہے۔ نہیں جناح پاگل ہے —— نہیں فقیر اپی پاگل ہے۔ وہ مزدوری کرتا ہے۔ ہُو ہُو ہُو۔"

پنجابی عورت چوراہے پر کھڑے ہوئے پولیس مین کو دیکھنے لگی اور اسی اثنا میں سامنے سے مس فاکس سائیکل پر آتی دکھائی دی اور آصف۔ اے ڈارلنگ حسینہ۔ تیرا انتظار کب سے تھا۔ کہتا ہُوا اس کی طرف بڑھا۔ وہ بھی اس کو دیکھ کر مسکراتی ہوئی سائیکل پر سے اُتر پڑی۔ پھر جانے کیا ہُوا ۔۔ ۔۔ ۔۔

چینی ریستوران کا سارا چوراہا غضب ناک چیخوں سے گونج رہا تھا —— مار ڈالا۔ —— ہاں مار ڈالا۔ خون۔ دوڑو پکڑو۔ پکڑو۔ مارو ۔۔ ۔۔ ۔۔

جب چیخیں مدھم ہو کر بھنبھنانے لگیں تو آسمان کے پہلے ستارے نے دیکھا کہ مس فاکس خون میں لتھڑی سمنٹ روڈ پر پڑی ہوئی تھی۔ اور خون کی دھاریں اس کی مرمریں لمبی پتلی دلآویز گردن سے نکل نکل کر بہہ رہی تھیں۔

آصف کو دو سپاہیوں نے پکڑ رکھا تھا۔ اور وہ اپنا خونی چھُرا فضا میں اُٹھائے ہوئے چیخ رہا تھا۔

"دیکھو —— سارا چُوسا ہُوا خون بہہ رہا ہے۔ اب میری بہن کے رُخساروں پر گیندے کے پھول کبھی نہ کھلیں گے —— ہاں اہل وطن۔ سارا چُوسا ہُوا خون ۔۔ ۔۔ میں نے مس فاکس کو مار ڈالا ہے۔ اپنی جوانی کو مار ڈالا ہے۔ ہاں اہلِ وطن۔"

پولیس انسپکٹر آصف کو گردنیاں دے رہا تھا۔ اور لوگوں کی چرچرچرچر زبانیں چل رہی تھیں۔

"واہ ... بڑا بہادر ہے ... عورت کو مار ڈالا۔"

"پاگل معلوم ہوتا ہے کوئی۔"

"ہائے رقابت —" شاید کوئی شاعر بولا۔

"اجی کوئی انقلابی معلوم ہوتا ہے۔" شاید کوئی کلرک بولا۔

"کم بخت ان نمک حرام انقلابیوں کی وجہ سے ہی دیس کو آزادی نہیں ملتی۔" شاید کوئی بنیا بولا۔

پولیس انسپکٹر غصے کے رعشے سے کانپتی ہوئی آواز میں اسے گردنی دیتے ہوئے بول رہا تھا۔ "بدمعاش، ذلیل، کمینہ ... ..."

آصف چیخ رہا تھا۔

مار ڈالا ہے۔ اپنی جوانی کو مار ڈالا ہے۔ سارا چوسا ہوا خون ... مس فاکس کو مار ڈالا ہے۔"

سپاہی گردنیاں دے دے کر اس کو اکسفورڈ اسٹریٹ پر دھکیلتے لے جانے لگے۔

"ہاں اہلِ وطن ... ..."

توند

گلاب چند کو اپنے باپ کی موت کا عرصے سے انتظار تھا۔ مگر نوّے برس کی عمر ہونے کو آئی تھی۔ اور اس کا باپ اب بھی سیب سنگترے، ٹماٹر، مکھّن اور ترکاریاں کھایا کرتا تھا۔ حتیٰ کہ سیب کی سُرخی اس کے گالوں میں رچ گئی تھی۔ سنگتروں اور ٹماٹروں کا رس اس کی رگوں میں لہو بن کر پھیل گیا تھا۔ مکھّن اور ترکاریوں نے اس میں نوّے برس کے انحطاطی دَور میں بھی ہر شام ایک میل سے زیادہ چہل قدمی کی توانائی پیدا کر دی تھی۔ جب رات ہوتی۔ گلاب چند اپنے باپ کو خوابگاہ میں جاتا دیکھتا۔ اس کی اُمید بندھ جاتی لیکن صبح ہوتی تو باپ اس کو روز کی طرح مسکراتا ہُوا جگاتا۔ "بیٹا۔ بہت دن چڑھ آیا۔ جاگ اُٹھو۔" گلاب چند جاگ اُٹھتا۔ مگر اُس کی اُمید سو جاتی۔ گلاب چند چڑ کر کہتا۔ "پتاجی ــــ آپ تو ... ... اور وہ پریشان

ہو جاتا کہ اب آگے کیا کہے۔ لیکن اس کا باپ "جب ہم جوان تھے۔" کہتا ہُوا ہنسنے لگتا۔ جیسے اس کا جملہ مکمّل کر رہا ہو۔ اس کی ہنسی اس کو اپنے باپ کی موت اور اس کی ساڑھے تین کروڑ کی دولت سے مایوس کر دیتی۔

اب اس کو اپنے باپ سے اتنی ہی نفرت ہو گئی تھی۔ جتنی کہ اپنی بائیسکل سے ۔۔۔ اس کی تمنا تھی کہ بائیسکل کے بجائے ایک اچھی سی خوبصورت کار ہو۔ ایک ہاتھ اسٹیرنگ پر ہو اور ایک ہاتھ مس لیلیٰ منی کی تیلی لچکیلی کمر میں ... وہ سیٹھ رتن لال کے بیٹے کی طرح ہر روز ایک نیا سوٹ، نئی نکٹائی اور نئے شوز پہنا کرے سیٹھ رحیم الدین کے ناخلف کی طرح کلاس کی تیتریوں کے لیے جا کلیٹوں، خوشبودار رومالوں، ناخن پالش کی شیشیوں اور رومانوی ناولوں کے تحفے خرید سکے ۔۔۔ مگر اس کا کروڑپتی باپ کالج کی فیس کے علاوہ اس کو صرف دس روپلے ماہانہ جیب خرچ دیا کرتا تھا۔ عجیب کھوسٹ کنجوس بوڑھا تھا۔ گلاب چند نصیحت کرتا "تم نہیں جانتے پیسہ کیسے جمع ہوتا ہے۔ یہ ساڑھے تین کروڑ کی دولت ... یہ ایک ایک پیسہ جوڑ کر جمع کی گئی ہے۔ میں نے اپنی ساری عمر صرف پانچ کُرتوں اور پانچ دھوتیوں پر گزار دی۔ جوانی جیسے کھانے پینے کے موسم میں صرف صبح اور شام دو ہی وقت کھایا کرتا تھا۔ صرف ایک کٹورہ دال اور دو موٹی روٹیاں۔ عورت کا ناچ عمر بھر میں ایک بار دیکھا۔ اور وہ بھی اس بڑھاپے میں ۔۔۔ اور محض اس لیے کہ کلکٹر صاحب نے رائے بہادر کا خطاب ملنے پر مجھ سے دعوت مانگی تھی۔

گلاب چند اپنی نفرت بھری نظروں سے اس کو دیکھتے ہوئے دل ہی دل میں پوچھتا — تو پھر زندہ کیوں ہو۔ اب زندگی سے تمہیں اور کیا لینا دینا رہ گیا ہے۔ ساڑھے تین کروڑ کی دولت۔ ایک کٹورہ دال دو موٹی روٹیاں۔ پانچ کرتے، پانچ دھوتیاں — اور عورت کا ناچ بھی تو دیکھ لیا۔

گلاب چند کو اپنے باپ سے نفرت کے علاوہ ایک ڈر بھی تھا۔ کیونکہ ادھر کچھ دنوں سے ایک مقروض کلرک اپنی جواں سال گلرخ لڑکی کے ساتھ ہر شام اس کے باپ کے پاس گڑگڑانے آتا تھا۔ گلاب چند ڈرتا تھا کہ کہیں سیب اور سنگتروں کا رس کوئی رنگ نہ لائے۔ ٹماٹروں کا رس لہو میں تلاطم نہ پیدا کر دے۔ یکھنی اور ترکاریاں حیاتی کیڑوں کو توانائی نہ عطا کریں۔ ورنہ پھر ساڑھے تین کروڑ کی دولت کے حصے بخرے ہو جائیں گے۔ اب تک وہ بلا شرکت غیرے ساڑھے تین کروڑ کی دولت کا اکلوتا وارث تھا۔ گلاب چند کی ماں سہاگ کے چوتھے برس ہی مر گئی — گلاب چند کبھی سوچتا کہ بڑی بھاگوان تھی بیچاری جو مر ہی گئی۔ ورنہ اس چاندی اور سونے سے بنے ہوئے مجسمے کے ساتھ زندہ رہ کر بھی کیا کرتی۔ اس بیچاری کی موت کے بعد روپوں کی چمک اور حدت نے گلاب چند کے باپ کو دوسری شادی کے لیے اکسایا ضرور۔ مگر اتفاق کی بات یا گلاب چند کی ماں کی روح کی کارستانی کہ جس لڑکی کو اسکے باپ نے منظور کیا۔ لڑکی کے والدین نے اس کو رد کر دیا۔ جن لڑکیوں کے والدین نے گلاب چند کے باپ کو پسند کیا۔ ان کو گلاب چند کے باپ نے پسند نہ کیا۔ اسی اثنا میں ایک اور رشتہ ایسا بھی ملا۔ جس پر جانبین

متفق ہو گئے۔ مگر شہر کے چند نوجوان طالب علموں نے اس بے جوڑ شادی کے خلاف کمیٹیاں کیں۔ دھمکی آمیز خطوط لکھے اور گلاب چند کے گھر کے کمپونڈ میں بھی اپنی شورش پسند طبیعت کا مظاہرہ کیا ــــ اس کے جواب میں بوڑھا کروڑپتی صرف مسکرایا اور لڑکی پھانس ہی لی۔ چودہ یا پندرہ برس کی ریکن لینن ٹائپ طالب علموں کے گروہ سے ایک طالب اپنی آرام کرسی سے اُچھل پڑا۔ جیسے ہنگام عمل آگیا ہے۔ چنانچہ عین اس وقت جب شب عروسی بُوڑھے کروڑپتی کے گھر پر چھا چکی تھی۔ اس کی دُلہن اپنے حجلۂ عروسی سے کہیں دُور ایک چٹیل میدان میں بل کھاتی ہوئی پگڈنڈی پر اس لینن ٹائپ نوجوان کے آغوش میں ڈری ڈری سہمی سہمی جا رہی تھی۔ منزل سے بےخبر مستقبل سے لاعلم۔

ناک کٹ گئی ــــ گلاب چند کے باپ نے کہا۔ اور اس کے بعد اس کی صحت خراب ہونے لگی۔ ہندوستان میں سب سے مہلک بیماری ناک کا کٹ جانا ہے۔ انڈین ایریکس میں اعداد شمار نہیں بتائے جاتے لیکن یہ صحیح ہے کہ یہاں اکثر و بیشتر اموات کا سبب ناک کا کٹ جانا ہے۔

اب گلاب چند ہر طلوع ہونے والے سورج کو امید دل سے چمکتی ہوئی آنکھوں سے دیکھا کرتا تھا۔ اور مزے میں آکر چٹکیاں بجاتے ہوئے گنگناتا ۔

چند روز اور مری جان فقط چند ہی روز

اب اس کو اپنی زندگی ایک خوش آئند زمانے کی امید میں بوجھل نہیں معلوم ہوتی تھی۔ اب بھی اس کے پاس صرف پانچ کوٹ اور پانچ پتلونیں تھیں۔ وہی تین نکٹائیاں، لوہا کئے کرتے جن کے پھوڑے نکلنے لگے تھے۔

تین جوتے اور ایک چپل —— اور وہی بائیسکل جس کا پچھلا پہیہ ہمیشہ "آوٹ" رہتا تھا۔ لیکن اب انہیں استعمال کرتے وقت اس میں جھلاہٹ پیدا نہ ہوتی۔ البتہ وہ مسکراتے ہوئے چٹکیاں بجا بجا کر بڑے سرور کے عالم میں تصور ہی تصور میں مس لیلا منی سے کہتا۔

چند روز اور میری جان فقط چند ہی روز

اب اس کے دوست احباب ہنسی اڑاتے تو بھی اس کو برا نہ لگتا۔ البتہ اس کو اس پارسی حرافہ سے بڑی چڑ تھی جو پڑھنے کے بجائے عاشقی کرنے کالج میں شریک ہو گئی تھی۔ وہ گلاب چند کے گٹھیل جسم، متناسب اعضاء، سپید رنگ اور لمبے قد سے خالص مادی محبت کرتی تھی۔ لیکن گلاب چند کو اپنی طرف ملتفت نہ دیکھ کر عجیب عجیب قصے اس کے اور اس کے باپ سے متعلق گڑھ رکھے تھے۔ کل ہی اس نے ایک نیا قصہ اپنے دل سے گڑھ کر کالج کے اکثر لڑکوں اور لڑکیوں کو سنایا تھا کہ گلاب چند کے باپ نے سپاری کی ایک ڈلی ڈوری سے باندھ کر چھت کے شہتیر سے لٹکا دی ہے اور کھانا کھانے کے بعد اس کو چوستا رہتا ہے۔ اور یہ ایک سپاری کی ڈلی وہ برابر پانچ سال سے چوس رہا ہے۔ گلاب چند نے یہ قصہ سنا تو دوسرے روز کالج ہی نہ گیا اور دل ہی دل میں دعائیں مانگتا رہا۔ کہ الٰہی موت دے دے مجھے یا میرے باپ کو۔

سارے کالج میں گلاب چند کا ایک ہی ہمدرد تھا —— مس لیلا منی۔ جو کبھی کبھی گلاب چند کی دلجوئی کیا کرتی تھی۔ ایک دن تو وہ گلاب چند کے لیے اسی پارسی حرافہ سے لڑ پڑی تھی اور اسی دن سے ایک نئی کہانی کالج میں حیرت

سے سُنی جانے لگی۔ کہ گلاب چند اور لیلا منی کے درمیان کچھ ہے ـــــ کوئی جال، کوئی تار، کوئی دھاگا ... !

گلاب چند کو جب لیلا منی اور پارسی حرافہ کی لڑائی کا حال معلوم ہُوا تو وہ فرطِ مسرّت سے بے وقوف ہوگیا اور اپنی بیوقوفی کے اظہار میں اُس نے مِس لیلا منی کو ناخنوں کی پالش کی ایک خوبصورت شیشی بھی دی۔ لیلا منی نے وہ نیل پالش لے تو لی۔ مگر کچھ ایسی بے اعتنائی سے کہ گلاب چند کو یہ ماننے میں تامّل ہونے لگا کہ لیلا منی اور اس پارسی حرافہ کی لڑائی کا سبب گلاب چند ہی ہے۔ وہ بیچارہ کیا جانتا تھا کہ لیلا منی کا نظریہ محبّت زمانے کے عام رجحان سے قطعی مختلف ہے۔ اظہارِ محبّت کے لیے وہ فیشن یا مارکٹ سے رجوع کرنا شاید بہت بُرا سمجھتی تھی ـــ لیکن اُس نے گلاب چند کو معاف کر دیا۔ کیونکہ آج کل کی محبوباؤں نے خود ہی اپنے پسندیدہ لڑکوں کو یہ راہ و رسم سکھائے ہیں۔

مِس لیلا منی کی ایک ہی نگاہ لطف کے بعد جیسے گلاب چند کی قسمت بدل گئی۔ اس کے عرصے کی ٹھکرائی ہوئی تمام آرزوئیں یکے بعد دیگرے مستجاب ہونے لگیں۔ اس کا باپ مرگیا وہ ساڑھے تین کروڑ کی دولت کا تنہا وارث بن بیٹھا مِس لیلا منی ہمیشہ کے لیے اس کی زندگی میں داخل ہوگئی۔ ہر روز ایک نیا سوٹ، نیا شوز اور نئی نکٹائی ـــــ ایک ہاتھ سٹیرنگ پر اور ایک ہاتھ لیلا منی کی نیلی گداز لچکیلی کمر میں ـــــ اور یہ سب کچھ اتنی جلدی جلدی ہوا کہ اس کا گٹھیلا بدن خوشی سے دن بدن

پھولنے لگا۔

پھر چند ہی برسوں بعد اس کی توند کو دیکھ کر ایسا معلوم ہونے لگا جیسے اس نے ساڑھے تین کروڑ کی تھیلی چوروں کے ڈر سے اپنی ہی توند میں چھپا رکھی ہو۔ یہ توند گلاب چند کے لیے بظاہر تو بڑے رعب، دبدبہ طنطنہ اور امارت کی نشانی تھی۔ مگر یہی توند گلاب چند اور لیلامنی کے درمیان حائل ہو گئی —— یوں نظر آتا جیسے لیلامنی کرۂ ارض کے ایک طرف کھڑی ہے اور گلاب چند دوسری طرف —— اور جیسے جیسے ساڑھے تین کروڑ کی تھیلی پھولتی گئی۔ گلاب چند کی توند بھی پھولتی گئی —— اتنی پھولتی گئی۔ کہ گلاب چند ڈرائنگ روم سے بیڈ روم تک جانے میں ہانپ ہانپ جاتا۔

ایک رات تو اس توند نے گلاب چند اور لیلامنی کو منظر عام پر شرمندہ کر دیا۔ جنگی امداد کے سلسلے میں گورنر بہادر نے انگریزی ناچ کا انتظام کیا تھا۔ گورنر کی بیوی رائے بہادر گلاب چند کے سینے سے لپٹی ناچ رہی تھی اور رائے بہادر گلاب چند قدم قدم پر ہانپ رہے تھے پسینہ پسینہ ہوئے جا رہے تھے۔ اس کو تو خیر گورنر کی بیوی نے برداشت کر لیا۔ لیکن توند کے وزن سے لڑکھڑا کر جب تیسری مرتبہ گلاب چند نے اس کے نازک پاؤں کچل دیئے تو شدت درد سے چیخ کر وہ بیہوش ہو گئی۔ اس وقت گلاب چند کا جی چاہا کہ اسی وقت کلوک روم کی کھڑکی سے چھلانگ مار دے تاکہ وہ نہ زندہ رہے اور نہ شرمندہ ہو۔

اس واقعہ کے بعد سے گلاب چند نے پبلک مقامات پر آنا جانا بہت ہی کم کر دیا۔ یہ توند اس کی زندگی میں جیسے پھوڑے کی طرح اُبھر آئی تھی۔ اس

کی زندگی کو بیمار بنا دیا تھا۔ وہ اپاہج سا ہو کر رہ گیا تھا۔ بچے، جوان بلکہ بوڑھے تک اس کی توند کو دیکھ کر ہنستے تھے۔ وہ اگر رائے بہادر نہ ہوتا تو شاید باآواز بلند پھبتیاں بھی کستے۔ گلاب چند لوگوں کی ہنسی کی پروا نہیں کرتا تھا۔ لیکن بعض اوقات فطری تقاضے سے مجبور ہو کر لیلامنی بھی ہنس پڑتی تھی۔ اور گلاب چند کچھ ملول سا ہو جاتا۔ لیکن لیلامنی کی ہنسی کو ہنسی ہی نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ ہنسی تو وہ ہے جس سے طبیعت کو فرحت ہو۔ یوں ہنسنے کو تو نئی نئی بیوائیں بھی ہنستی ہیں۔ یتیم بچے بھی ہنستے ہیں۔ جوانمرگ بچوں کے والدین بھی ہنستے ہیں۔ بھوکے ننگے بھی ہنستے ہیں۔ بھکاری بھی ہنستے ہیں۔ ہندوستانی بھی ہنستے ہیں۔ دراصل ہنسنے کے لیے کسی خاص مذاق کی بھی کوئی ضرورت نہیں۔ اب یہی دیکھیے کہ گلاب چند کبھی اپنی قمیص کو بدلنے کے لیے اُتارتا تو اس کی توند کا گداز چکنا پھیلاؤ دیکھ کر فطری چہل سے مجبور ہو کر لیلامنی مُسکراتی۔ مگر یہ مسکراہٹ ایک غیور مہمان کی طرح کچھ دیر کے لیے اس کے ہونٹوں پر آتی اور چلی جاتی۔ جیسے میزبان کو تکلیف نہ دینا چاہتی ہو۔ اور یہ واقعہ بھی تھا۔ کہ اس ہنسی سے لیلامنی کو بعد میں بڑی تکلیف ہوتی تھی۔ اس توند نے اس کو لمحاتی ہنسی عطا کر کے اس کی دوامی مسرّت چھین لی تھی۔ اور ایک سوکن کی طرح اس کے اور گلاب چند کے درمیان حائل ہو گئی تھی۔

ڈانس میں خفت اُٹھانے کے بعد گلاب چند صرف شام ہی کو لیلامنی کے اصرار پر باہر نکلتا۔ اور گول باغ کی روشوں پر کچھ دیر ٹہل کر واپس

آجاتا۔ لیکن ایک دن لیلامنی کی رقیب کالج کی وہ پارسی حرافہ جو اب آزاد جنسی تعلقات پر زندگی بسر کر رہی تھی۔ اپنے چند آوارہ دوستوں کے ساتھ وہاں ٹہل رہی تھی۔ گلاب چند اور لیلامنی کو دیکھا تو بس اُچھل پڑی۔ اور لیلامنی سے اپنی پُرانی رقابت کا بدلہ لینے کی غرض سے اس کے ساتھ ایسے گندہ اور فحش مذاق کیے کہ اس کے آوارہ دوستوں کے قہقہوں سے گلاب چند کے جسم پر رونگٹے کھڑے ہو گئے ۔۔۔ گھر پہنچنے کے بعد اس نے لیلامنی سے کہہ دیا کہ وہ اب کبھی باہر نہ جائے گا۔ وہ اب تک صرف یہ سمجھتا تھا، کہ لوگوں کی ہنسی ٹھٹھوں، فقرہ بازیوں اور چھیڑ چھاڑ کا باعث لیلامنی کا جمال ہے۔ مگر صدیاں گزر جانے کے بعد بھی انسان کا مذاق اتنا صحت مند کہاں ہُوا۔ البتہ کمینگی پوری طرح برقرار ہے۔ بھلا یہ بھی کوئی انسانیت ہے کہ کسی کی پھُولی ہوئی توند کسی کی لٹکی ہوئی چٹیا۔ کسی کی کالی آنکھ۔ کسی کے کوب اور لنج کا مذاق اُڑایا جائے ۔۔ تعلیم و تہذیب کی اتنی ترقی کے بعد بھی انسانیت ابھی تک ایک اضافی صفت ہے۔

لیلامنی کا اصرار تھا کہ وہ لوگوں کی زبان، ان کی نظروں اور ان کی ہنسی ٹھٹھے کا خیال نہ کرے۔ لیکن انسان کی فطری بزدلی کے سبب وہ لوگوں سے اتنا ہی ڈرتا تھا جتنا مینڈک سے ۔۔۔ جانے وہ مینڈک جیسے بے بس، بے ضرر اور بے زہر جانور سے اتنا کیوں ڈرتا تھا۔ سنتے ہیں کہ بچپن ہی میں کوئی ایسا ڈر مینڈک سے اس پر طاری ہو گیا یا طاری کرا دیا گیا کہ اب جوانی میں بھی جہاں مینڈک نظر آیا۔ اور گلاب چند اُچھل کر الگ ہو گیا۔

اب گلاب چند مینڈک کے علاوہ انسان سے بھی ڈر کر اچھل کر الگ ہو گیا تھا۔ اپنے مکان کی چار دیواری میں بند ہو گیا تھا۔ دن بھر صوفوں پر، گدّوں پر، پلنگوں پر بیٹھے بیٹھے اس کا جسم بالکل ہی اپاہج ہو گیا۔ تجوریوں، تھیلیوں، گاؤ تکیوں اور توشکوں کی صحبت میں توند اور بھی پھولنے لگی۔ اور اب تو یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے جسم پر کرّۂ ارض اٹھائے اٹھائے پھر رہا ہے۔ یہ صحیح بھی تھا۔ کیونکہ اس کی ساڑھے تین کروڑ کی دولت نے کرّہ ارض خرید ہی تو لیا تھا۔

انہی دنوں فیملی ڈاکٹر کے مشورے سے لیلامنی نے گلاب چند کیلئے ایک سٹریچر نما گاڑی خرید لی جس کے پہیئے دھکیل دھکیل کر وہ اپنے کمرے سے لیلامنی کے بیڈ روم تک پہنچ جایا کرتا۔ لیکن اب لیلامنی کا بیڈ روم، بیڈ روم نہ رہا تھا۔ بلکہ ہسپتال کا ایک کمرہ جہاں وہ ہسٹیریا کے دوروں سے تڑپتی رہتی تھی۔ اب لیلامنی کی صحت بھی خراب ہو گئی تھی۔ اس کا چہرہ گیندے کے پھول کی طرح زرد تھا۔ ہونٹ سوکھے سوکھے پژمردہ، ہمیشہ کھلے کھلے گیسو، مانگ ایک ٹیڑھی بنگی پگڈنڈی ایک ایک ساڑھی تین تین دن تک پہنے ہوئے ـــ اب بھلا وہ کس کے لیے بال بنائے۔ کس کے لیے ساڑیاں بدلا کرے۔ کس کے لیے مانگ سنوارے؟

جب لیلامنی کی صحت بھی بہت خراب ہو گئی تو فیملی ڈاکٹر کے مشورے سے گلاب چند اور لیلامنی کشمیر چلے گئے۔ ان کو کشمیر بھیجنے میں شاید مقدر کی بھی کوئی چال چھپی ہوئی تھی کشمیر کی جانفزا ہواؤں نے چند ہی دنوں میں لیلامنی کے گالوں کو اپنی شفق کا تھوڑا سا سرخ رنگ ضرور عطا کیا۔ لیکن ایک بڑی ابر آلود شام کو گلاب چند نے لیلامنی کو باہر تفریح کے لیے جانے سے لاکھ منع کیا۔ لیکن لیلامنی کو

تو کشمیر کی نشیلی ہواؤں اور خاکستری بادلوں سے عشق تھا۔ وہ گنگناتی مسکراتی چلی ہی گئی۔

اور پھر نہ لوٹی۔

گردشِ شام و سحر جاری ہی رہی۔ اور گلاب چند لیلا منی سے مایوس ہو کر کشمیر سے لوٹ آیا۔ اب اس کی زندگی ایک ویرانہ بن گئی تھی۔ وہ جیسے انسانوں، حیوانوں، جمادات اور نباتات کی دنیا کے بجائے کسی غیر آباد سیّارے میں آ گیا تھا۔ کیونکہ جب سے وہ دنیا اور دنیا والوں سے لاتعلق ہو کر اپنے گھر میں بند ہو گیا تھا۔ چند بے زبان جانوروں کی طرح نوکروں کے سوا صرف لیلا منی ہی وہ اکیلی انسان تھی جس کے وجود، جس کی باتوں، جس کی ہنسی، جس کی خوشبو اور جس کے لمس کو محسوس کر کے اس کو دنیا سے اپنے وجود کی وابستگی کا احساس ہوتا تھا۔ اب وہ بھی اس کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ وہ آٹھوں پہر لیلا منی کی غم انگیز یادوں میں ڈوبا رہتا۔ اس نے اب کھانا پینا بھی چھوڑ دیا تھا۔ اور اپنے کارخانوں اور دکانوں سے بھی غافل ہو گیا تھا۔

ابھی چار سال بھی نہ پورے ہوئے ہوں گے کہ ساڑھے تین کروڑ کی تھیلی خالی ہوتی گئی۔ جیسے جیسے ساڑھے تین کروڑ کی تھیلی خالی ہوتی جا رہی تھی۔ اس کی توند بھی سکڑتی جا رہی تھی۔ اور جس دن ساڑھے تین کروڑ کی تھیلی بالکل خالی ہو گئی۔ اس کی دکانوں کا دیوالہ ہو گیا۔ کوٹھیاں بک گئیں۔ موٹریں فروخت ہو گئیں۔ اور وہ آویزے بک گئے جن کو خریدنے کے لیے لیلا منی ایک بار دو دن تک روٹھی رہی تھی۔ اس دن گلاب چند اپنی پچھلی ہوئی

تو ند پر اپنی ڈھیلی ڈھالی پتلون بار بار کھینچتے ہوئے سوچتا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ کیا ہو چکا ہے۔ اور کیا ہونے والا ہے۔

اب گلاب چند رائے بہادر نہ تھا۔ بلکہ صرف گلاب چند جو خالی جیب اور خالی پیٹ ریلوے اسٹیشن سے باہر نکلتے ہوئے مسافروں کا بوجھ اُٹھانے کے لیے دوڑتا۔ اور مسافروں کا اسباب اُٹھا کر دوڑتے وقت اس کے دل میں ایک تمنّا پیدا ہوتی کہ کاش لیلامنی آج زندہ ہوتی تو وہ گلاب چند کو اس طرح تیز دوڑتا دیکھ کر اس کی زندگی کی اس دَوڑ، رفتار اور حرکت کو دیکھ کر کتنی خوش نہ ہوتی! لیلامُنی کی یاد آتے ہی وہ مسافروں کے سُوٹ کیس، ٹرنک ہینڈ بیگ، اٹاچی اور بستر اس طرح اُٹھا لیتا۔ جیسے لیلامُنی کو آغوش میں دبوچ لیا ہو۔

ایک دن لیلامنی اسے ملی۔

لیکن وہ پہلی لیلامنی نہ تھی۔ اور نہ اس کی ہم شکل تھی۔ بلکہ گلاب چند کے نئے پڑوسی ہم پیشہ مزدور کی سانولی سلونی بیٹی تھی۔ جس پر جوانی دس سال سے منڈلا رہی تھی۔ لیکن اس کا باپ اپنی بیٹی کے ہاتھوں کو مہندی سے رنگنے کے لیے ایک پیسہ نہ بچاتا تھا۔

ایک رات اسی مزدور کے چبوترے پر بیٹھے ناریل پیتے پیتے گلاب چند نے پوچھ ہی لیا۔

"کاکا۔ بٹیا کو ٹھکانے لگانے کا کوئی انتظام کیا ہے یا نہیں؟"

کاکا بھنگ کے نشے میں چور تھا اُس نے مدہوشی کے عالم میں اپنا راز بتا دیا۔

"اُسے ٹھکانے لگ جائے گی خود بخود جیسے اس کی ماں ٹھکانے لگ گئی تھی۔
گلاب چند نے حیرت سے پوچھا۔
"کاکا۔ کیا تمہاری بیوی بیاہتا نہیں تھی؟"
کاکا نے نشے میں جھوم کر کہا۔
"میں پوچھوں اس سالے مزدور باڑے میں کس کس کی بیویاں بیاہتا ہیں؟"
گلاب چند کے ہاتھ سے ناریل گر گیا۔ اور حیرت سے بے اختیاری کے عالم میں چبوترے سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ گلاب چند کو اس مزدور باڑے میں زندگی کا اصلی لُطف معلوم ہو رہا تھا۔ وہ زندگی جو صرف آٹے دال کا بھاؤ ہے۔ وہ زندگی جو پھٹے ہوئے کپڑوں سے جھانک کر مُسکراتی ہے۔ لیکن کاکا کے جملے نے زندگی کے اس نئے نشے کو ایک دم اُتار دیا۔ اس کی رگوں میں ایک اُونچے شریف خاندان کا لہو دَوڑ رہا تھا۔ اسی لیے کاکا کے اس جملے سے وہ گھبرا کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ چاہتا تھا کہ وہاں سے کہیں بھاگ جائے۔ لیکن زندگی کی اتنی بہت سی قلابازیاں کھانے کے بعد اس کو ـــــ اب بہت کچھ ہوش آ چکا تھا۔ جب اُونچے شریف خاندان کے لہُو کا تموّج اس کی رگوں میں ـــــ کچھ کم ہُوا تو وہ مسکراتے ہوئے آہستگی سے پھر چبوترے پر بیٹھ گیا ـــــ اُونچائی۔ شرافت، خاندان ـــــ قیمتی لہو ـــــ وہ سب کے فریب سے ـــــ آگاہ ہو چکا تھا۔
اس رات وہ سوچتا رہا کہ کیا پروہت کی ـــــ گرہ، برہمن کے اشلوک ـــــ برادری کی دعوت ـــــ اور دان پُن کے بغیر عورت ـــــ اور مرد کا بندھن ممکن ہی نہیں ـــــ؟ پر جن میں اتنی حیثیت نہ ہو وہ کیا

کریں — کاکا بے قصور ہے۔ میں جھوٹا ہوں — کاکا بے قصور ہے — میں جھوٹا ہوں۔ اس کی بیوی بیاہتا ہے۔

اس رات اس نے چار خواب دیکھے۔ "لیلامنی!۔ لیلامنی!۔ لیلامنی!۔ لیلامنی!"

دوسری شام کاکا تمام پڑوسی مزدوروں کو جمع — کر کے گلاب چند کو بُری بُری گالیاں سُنا رہا تھا۔ لیکن نہ گلاب چند کا کہیں پتہ تھا۔ اور نہ اس کی لاڈلی کا۔ البتّہ ایک دوسرے شہر کی اندھیری — گلی میں ایک ادھیڑ عمر کے — رنڈوے کے گھر لیلامنی گلاب چند کے آغوش میں مسکرا رہی تھی — شرما رہی تھی۔ پسینہ پسینہ ہوئی جا رہی تھی۔

❖ ❖ ❖

اب گلاب چند کی زندگی کا فالج دُور ہو گیا تھا۔ وہ ایک دوڑتی بھاگتی متحرک متموّج ہنستی مسکراتی زندگی میں داخل ہو چکا تھا۔

ہر صبح لیلامنی کے سانولے گال کو ایک محبّت بھرے ہلکے سے طمانچے سے دہکاتے ہوئے خالی جیب مزدوری کو چلا جاتا اور شام کو سات آنے لیلامنی کے پلّو میں باندھ دیتا۔ اس لیلامنی کی سب عادتیں اچھّی تھیں لیکن ایک نقص یہ تھا کہ وہ سات آنے میں سے ایک آنہ بچا لینا چاہتی تھی اور گلاب چند کو یہ کنجوسی مطلق پسند نہ تھی۔ وہ ڈرتا تھا کہ کہیں اکنّیوں کا ڈھیر پھر سے اس کی توند میں نہ جمع ہونے لگے۔ اور توند کا زندگی کو اپاہج کر دینے والا پھوڑا نہ نمودار ہو۔ اسی لیے اُس نے مجبوراً سگرٹ پینے کی عادت ڈال لی اور لیلامنی کو اکنّی بچانے کی لعنت سے نجات دے دی۔ اب رہا کھٹکا نہ۔ گلاب چند کی اس حرکت پر

لیلا منی کو شبہ تھا کہ اس کے دماغ میں کوئی خرابی ہے۔

ایک بار لیلا منی نے اس سے کہہ ہی دیا۔

" تمہاری یہ فضول خرچی اچھی نہیں۔ کیا جانے کل کیا ہونے والا ہے۔ بیماری، دکھ، درد، غریبی، دوا دارو، کپڑے لتّے۔ کچھ تو سوچو۔"

گلاب چند۔ اب زندگی کے بڑے رومانوی موڈ میں تھا۔ اس نے اس کے دونوں کندھے شوخی سے جھنجوڑ کر کہا۔

" اری پگلی۔ کچھ نہ سوچ، کل کچھ بھی نہیں ہونے والا ہے۔ ضرورت سے زیادہ پیسہ جمع کرنے سے ہی دکھ درد اور بیماریاں آتی ہیں ــــ بڑی بڑی توندیں کے اتنے پھوڑے نکل آتے ہیں۔ اور میری جان میری پیاری۔ ایک لیلا منی تو میں نے کھو دی ہے۔ اب تجھے بھی کھونا نہیں چاہتا۔ سمجھی میری پیاری۔

ان پڑھ جاہل لیلا منی اس کی باتیں کیا سمجھتی۔ البتّہ اس کا شبہ جیسے یقین میں بدل گیا کہ گلاب چند کے دماغ میں ضرور کوئی خرابی ہے۔

آنچل ہے کہ پرچم!

میاں فضل دین کی دُکان سے جب میں نے جارجٹ کی ایک سُرخ ساڑھی خریدی تو اس وقت نامعلوم کمبخت ظہیر کہاں چھُپا بیٹھا تھا۔ ساڑھی خرید کر جونہی میں نے ایسوسی ایشن کے تنگ و تاریک بوسیدہ کمرے میں قدم رکھا۔ ظہیر نے میرے ہاتھ سے ساڑھی کا پیکٹ چھین کر سب ساتھیوں کے سامنے کھولا۔ اور گہری گہری نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے ڈانٹنے لگا۔ "دیکھ رہے ہو اس بگلا بھگت کو ۔۔۔ بتاؤ مہاشے وہ کون ہے ۔۔۔ کون بدنصیب ہے وہ؟" سب ساتھی حیرت سے میرا منہ تک رہے تھے جیسے قدرت نے میری پسلی سے کوئی عورت تخلیق ہی نہ کی ہو یا جیسے میرا دل راز و نیاز عشق کے قابل ہی نہ ہو۔ مجھے ظہیر کی اس بدتمیزی پر غصّہ آگیا اور میں نے کڑک کر جواب دیا۔

"میں نہیں بتاتا کوئی بھی ہو۔ تم کون ہوتے ہو پوچھنے والے!"

ظہیر مرعوب ہو کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ اب اس کی نظروں میں وہ گہرائی نہ تھی۔ صرف آنکھیں میرے چہرے پر لگی ہوئی تھیں جیسے وہ پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو اور سوچ رہا ہو کہ میں ایک من پسند سیاسی کارکن ہوں یا ایک خاص عمر پر پہنچا ہوا مرد۔ جس طرح ہر مرد کو عورت کی اہانت اور تذلیل کے موقع پر غصہ آ جاتا ہے۔ میری آنکھوں میں بھی شعلے بھڑکنے لگے ۔۔ اس وقت وزیر محمد نے مجھے چمکارتے ہوئے کہا۔

"نہ نہ ناراض نہ ہو۔ میرے پیارے دوست، ہم پوچھتے ہیں کہ وہ بھی تمہارے جیسی لمبی تو نہیں ؟"

میں نے مسکراہٹ روکنے کی ناکام کوشش میں منہ پھیرا۔ مگر ساہنی نے دیکھ لیا۔ اور "وہ مارا" کہتا ہوا مجھ سے لپٹ گیا۔ اگر وزیر محمد وہ ہنسی کی بات نہ کہہ دیتا۔ تو شاید میں ظہیر کی قمیص کا کالر پکڑ لیتا اور ساہنی کے ایک طمانچہ بھی لگا دیتا۔ مگر میری مسکراہٹ نے تو خود مجھے ہی شکست دے دی تھی۔

ساہنی نے شرارت سے میرے آگے ہاتھ جوڑے اور جھوٹ موٹ گڑگڑانے لگا۔ "بتا دے نا بھیّا۔ وہ کون بدنصیب ہے۔ ہم راون تو نہیں جو تیری سیتا کو بھگا لے جائیں۔"

میں بتانا نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے میں نے اپنے دونوں لب مضبوطی سے بھینچ لیے۔ مگر وزیر محمد کو میری ایک کمزوری معلوم تھی۔ اس نے دھمکی کے طور پر سر ہلاتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ گدگدی کرنے کے لیے میری پسلیوں کی طرف بڑھائے اور میں تڑپ اٹھا۔

"اچھا۔ اچھا۔ بتاتا ہوں۔"

اب سب ساتھی میری طرف جھک گئے۔ میں نے جھینپ کر مسکراتے ہوئے

کہا "بل ... قیس"

"کیا کہا۔ بلقیس — !" سب چیخ پڑے جیسے کوئی نعرہ لگا دیا ہو۔ تمام ساتھی کی نگاہیں میرے ملبوترے چہرے میں گڑی ہوئی تھیں۔ ان نگاہوں میں میں نے کیا کیا دیکھا — کسی میں حسرت — کسی میں یاسیّت۔ کسی میں قنوطیّت — کسی میں رقابت!

بات یہ ہے کہ سب ساتھی بلقیس کے صنم خانے کے کافر تھے۔ اور میں ایک ممتاز کافر جس کو بلقیس کی نظروں اور مسکراہٹوں نے نوازا تھا۔ پورے دو سال سے میں بلقیس سے بالکل خاموش طریقے پر محبّت کر رہا تھا اور وہ میری محبّت کا جواب نہایت پُرامن طریقے پر دے رہی تھی — بلقیس کے کپڑوں کی بُوئے عطر تو ساری فضا میں پھیل گئی تھی۔ مگر عشق ابھی مستور ہی تھا۔ بسا اوقات ہم بھی یہی محسوس کرتے تھے کہ یہ عارف اور بلقیس محبّت نہیں کر رہے۔ بلکہ ان دونوں کے اندر ہی اندر کوئی اور ہستیاں مستور ہیں جو دونوں ہیں اس قدر مدغم ہو گئی ہیں کہ ایک بالکل نئی ہستی وجود میں آ گئی ہے۔

دوپہر کے قریب سب ساتھی جا چکے تھے۔ نیشنلسٹ ورکرز ایسوسی ایشن کی بوسیدہ چھت کی ٹیڑھی بینگی شہتیر سے چپکی ہوئی ایک چھپکلی ذرا ذرا سی غضبناک آنکھوں سے مجھے دیکھ رہی تھی اور میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا سوچ رہا تھا میں کیا بیوقوف ہوں کہ گدگدی جیسی حقیر دھمکی کے ڈر سے وہ راز بلکہ وہ محبّت آشکارا کر دی جو کیسی کیسی مصیبتیں جھیل کر دل کے نہاں خانے میں پوشیدہ رکھی تھی۔ عالمِ ہوش میں سرِ محفل بلقیس کا نام لے لینا کیا یہی آدابِ عشق ہیں؟ شاید حقیر چھپکلی ذرا ذرا سی غضبناک آنکھوں سے یہی مواخذہ کر رہی ہو — اور یہ جارجٹ کی ساڑھی — اب بلقیس اس کو پہن کر اپنے آپ کو کیا چھپا

سکتی ہے۔ جب کہ خود میں نے اس کو سب کے سامنے عریاں کر دیا ہے۔

میرا دل گھبرانے لگا۔ میں یوں محسوس کر رہا تھا جیسے اب میری زندگی میں وہ بھیانک انقلاب رُونما ہو چکا ہے جو اس انقلاب سے زیادہ بھیانک ہے جس کی ہم تیاریاں کر رہے ہیں۔ میں نے تہیہ کر لیا کہ اب یہ ساڑھی فضل دین کو واپس کر دوں گا۔ آج ملاقات کا وعدہ ہے مگر جب تک میرا ضمیر مجھے ملامت کرتا رہے گا۔ میں بلقیس کو اپنی منحوس صُورت نہ دکھاؤں گا۔ کُرسی سے اُٹھ کر میں دروازے تک گیا۔ وہاں ہماری ایسوسی ایشن کا نوکر ایک مرہٹہ نژاد نوعمر چھوکرا گھٹنوں میں مُنہ چھپائے اُونگھ رہا تھا۔ میں نے اس کو جھنجوڑ کر جگایا اور کہا "دیکھ —— ذرا جا کے میاں فضل دین سے کہنا کہ یہ ساڑھی پسند نہیں آئی۔ میں آج شام ..."

"بھلا کیوں پسند نہیں آئی ساڑھی۔ میں بھی دیکھوں" یہ بلقیس کی باریک سریلی آواز تھی۔ جس نے میری موٹی اور بے ہنگم آواز کو قطع کر دیا تھا۔ بلقیس کی صُورت دیکھتے ہی میں نے یوں محسوس کیا۔ جیسے کوئی نیا چور پہلی چوری میں پکڑا جائے۔ بلقیس کے گالوں میں پہلے گلاب کے پھُول کھِلتے تھے۔ آج وہاں دو انگارے دہک رہے تھے۔

اُس نے میری طرف بالکل نئی نظروں سے دیکھا جیسے وہ مجھے پہلی مرتبہ دیکھ رہی ہے اور پھر ساڑھی کا پیکٹ ہاتھ میں لے کر اسے دیکھتے ہوئے کہا "کامریڈ عارف یہ ساڑھی تو بہت اچھی ہے۔ کیوں واپس کرتے ہیں آپ۔ عاشق اگر اپنی محبوبہ کو ساڑھی کا تحفہ نہ دے تو عشق مکمّل کیسے ہوگا۔ اور دیکھیے کتنی سستی ہے ہماری محبّت! صرف ایک جارجٹ کی ساڑھی۔ اب بلقیس اور بیسوا میں کتنا فرق رہ گیا ہے مسٹر عارف! بہر صورت ہم "قابل مبارک باد" ہیں کہ ہم ہی وہ پہلے عاشق ہیں۔ جنہوں نے عشق

کی تعمیر مکمّل کر دی۔ اب معماروں کا کیا کام ہے۔ میں یہ جارجٹ کی ساڑھی شکریے کے ساتھ قبول کرتی ہوں۔ خدا حافظ۔"

"بلقیس۔ بلقیس۔" میں نے بھرّائی ہوئی آواز میں پکارا۔ مگر بلقیس جا چکی تھی۔ میں قریب کی کرسی پر گر پڑا۔ بلقیس نے میرے کانوں اور میری رُوح میں کیسا مہلک زہر انڈیل دیا تھا۔ اور اب تو وہ غضبناک چھپکلی بھی رینگ رہی تھی۔ جیسے اس نے بھی محاسبہ ختم کر لیا ہو۔ میں یوں محسوس کر رہا تھا۔ جیسے بلقیس نے مجھے کرّۂ ارض سے دھکیل کر گرد اگرد پھیلی ہوئی اندھیری اور گہری خلا میں پھینک دیا ہو۔ میں نے اپنا سر دونوں ہتھیلیوں میں سنبھال لیا۔ اس وقت مریٹھ چھوکرے نے مجھ سے پوچھا۔ "صاحب چائے لاؤں۔"

یہ چھوکرا میری عادت سے خوب واقف ہے۔ جب کبھی میں اپنا سر دونوں ہتھیلیوں میں سنبھال لیتا ہوں تو وہ سمجھ جاتا ہے کہ مجھے چائے چاہیے!

مگر کیا چائے بلقیس کے زہر کی تریاق ہے؟

⁂ ⁂ ⁂

اس سانحے کے بعد سے میری زندگی کا اندھیرا پھر گہرا ہونے لگا۔ اور میں ایک گُم کردہ راہ مسافر کی طرح بلقیس کے چہرے کی صرف ایک شعاع۔ اس کی جبیں سے پھُوٹتی ہوئی صرف ایک کرن۔ اس کی آنکھوں سے جھانکتے ہوئے صرف ایک تارے کا محتاج تھا کہ میں اپنی راہ ڈھونڈوں۔ زندگی کی راہ متعیّن کر لوں۔

آٹھ دن گزر گئے۔ مگر بلقیس کہیں نہ دکھائی دی۔ اس نے ایسوسی ایشن کو خیرباد کہہ دیا تھا اور شاید کالج جانا بھی چھوڑ دیا ہو۔ میرے دل میں طرح طرح کے وسوسے

پیدا ہو رہے تھے اور ہندوستانی ناولوں کی وہ تمام عورتیں نظروں کے آگے گھوم رہی تھیں جنہوں نے عشق کی رسوائیوں سے بچنے کے لیے قربانگاہ عزرائیل پر اپنی بھینٹ چڑھا دی تھی۔ کبھی یہ خیال ڈرا دیتا کہ اس حادثے سے متاثر ہو کر وہ بیمار نہ ہو گئی ہو۔ کیونکہ جب سے ایم اے میں فلسفہ لیا تھا وہ بڑی حساس ہو گئی تھی۔

مگر نہ وہ بیمار تھی اور نہ اس نے جان دی۔ ایک دن میں نے اس کو دیکھا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ بجلی محل کے قریب بلقیس اور وزیر محمد بڑی دیر سے کھڑے نہ جانے کیا باتیں کر رہے تھے۔ بلقیس جیسی پہلے تھی۔ ویسے ہی اب بھی تھی مگر اس کے گالوں کے گلاب ضرور کملائے ہوئے تھے۔ یہ کیوں ... ؟

میں سب کچھ سمجھ گیا کہ میری ٹریجیڈی کا پس منظر کیا تھا۔ عورت کے لیے قابیل نے اپنے سگے بھائی ہابیل کو مار ڈالا۔ تو یہ بیچارہ وزیر محمد تو صرف میرا ایک دوست ہے۔ اور دوست کا مفہوم ہے۔ ایک چھپا ہوا دشمن۔ وزیر محمد کے اندر چھپا ہوا ایک اور وزیر محمد ہے جو عورت کے سامنے مسکرائے بغیر رہ ہی نہیں سکتا۔ وزیر محمد اور میں دوست کے علاوہ مرد بھی ہیں۔ میں بحیثیت ایک سیاسی کارکن وزیر محمد کے وجود کو بہت ضروری سمجھتا ہوں اور بحیثیت ایک مرد اس کو اسی اوقیانوس عدم میں دھکیل دینا چاہتا ہوں جہاں سے وہ آیا ہے۔

اور وزیر محمد جو ایک بائیس سالہ مرد ہے بلقیس پر اس لیے جان دیتا ہے کہ اس کی منگیتر کالی ہے اور وہ وزیر محمد جو نیشنلسٹ ہے۔ ساری سفید فام قوموں سے نفرت کرتا ہے۔ یہ وزیر محمد انگریزوں سے کوئی ہمدردی نہیں رکھتا۔ اور وہ وزیر محمد ڈبلیو ڈی اینڈ ایچ او ولس کی سگرٹوں پر جان دیتا ہے۔

بلقیس چلی گئی، تو میں نے پیچھے سے وزیر محمد کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ وہ چونک کر میری طرف مڑا، قبل اس کے کہ میں اس کو اس کی نئی زندگی کی مبارکباد دوں اس نے خود ہی کہنا شروع کیا۔ جیسے اس کا جرم مواخذے سے گھبراتا ہو ــــ

"یار عارف! تم بھی عجیب بیوقوف ہو۔ سُنا بلقیس کیا کہتی تھی۔ اس نے کہا کہ عارف مجھے جارجٹ کی ساڑھی پہنا کر اپنی ملکیت بنانا چاہتا تھا۔ پرائیوٹ پراپرٹی۔ کیا سمجھے؟ مگر یہ صحیح ہے کہ ـــ اب بھی وہ تم سے اور تمہارے اندر بھڑکتی ہوئی آگ سے محبت کرتی ہے۔ مگر یہ ملکیت ... ... بھئی عجیب فلسفی لڑکی ہے۔ کہتی تھی کہ اس جارجٹ کی ساڑھی کی بدولت عارف کے کیریکٹر کی چابی اس کے ہاتھ لگ گئی۔ بھلا کیا نازک دماغی ہے یہ؟ کیوں...؟"

"لو سگرٹ پیؤ۔"

"بھئی وزیر محمد۔ کچھ بھی ہو بلقیس تمہاری منگیتر سے تو بہت زیادہ خوبصورت ہے۔"

"کیا کہا" وزیر محمد اس غیر متوقع چوٹ سے تڑپ کر بولا۔ مگر میں وزیر محمد سے آگے نکل گیا۔ اور سوچنے لگا۔ کہ فی الحقیقت کون آگے نکل گیا ہے؟

⁂ ⁂ ⁂

انسان بذاتِ خود بہت ڈرپوک ہے بغیر ایک دوسرے کی مدد کے وہ کچھ کر ہی نہیں سکتا۔ اسی بزدلی کو چھپانے کے لیے ایک بڑا خوبصورت نام تجویز کیا گیا ہے۔ معاشرتی حیوان۔ اب مجھی کو لیجیے۔ جب تک بلقیس میری زندگی میں داخل تھی۔ مجھ میں جوئے شیر لانے کا بھی حوصلہ تھا۔ اب یک و تنہا ہو کر بُری طرح زندگی سے ڈرنے لگا ہوں۔ جیسے اگر کوئی گناہ عظیم مجھ سے سرزد ہوا ہے تو وہ بجز زندگی

کے اور کچھ نہیں۔ شاید میں زندگی سے بھاگ جاتا مگر سیاسی سویرے کا طلوع، وصالِ بلقیس سے زیادہ عزیز تھا۔ ورنہ موت تو ایک چھوٹے سے چاقو میں بھی مل سکتی ہے۔

کبھی کبھی تنہائی میں میری قنوطیت کے متلاطم سمندر میں ایک جل پری اپنی باہیں پھیلائے میری طرف تیرتی نظر آتی۔ میں سگرٹ پھینک کر کمال وارفتگی میں اپنے دونوں ہاتھ پھیلا دیتا اور بھرّائی ہوئی آواز میں پکار اُٹھتا "بلقیس۔ بلقیس۔ مائی ڈیر بلقیس۔"

اور میری آنکھوں میں آنسو آجاتے۔ بلقیس نے میرا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ مگر بلقیس کی اُمید نے میرا دامن نہ چھوڑا۔ اور میں قدرت سے گڑگڑا کر التجا کرتا کہ کہیں وہ دن نہ آجائے کہ بلقیس کی اُمید بھی میرا ساتھ چھوڑ دے۔ اور میں بالکل ہی لُٹ جاؤں۔

مگر میں ایک انسان ہوں جس کو حوادثاتِ عالم پر کوئی اختیار نہیں ہستی کی ذمّہ دار وہ مشیتِ ایزدی ہے جس کی آنکھیں نہیں۔ میں تو صرف دعا مانگ سکتا ہوں۔ دُعا کا پُورا ہونا یا نہ ہونا میرے اختیار میں نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ دن؟ وہ بھی آگیا۔ جب میرے اور بلقیس کے درمیان وزیر محمد ہمیشہ کے لیے آگیا۔ اور آخری کچّا دھاگا بھی ٹوٹ گیا۔ جس سے میری کتنی اُمیدیں بندھی ہوئی تھیں۔

وہ دن تو آگیا۔ مگر قیامت نہیں آئی۔ اور قیامت بھی حسینوں کے وعدہ سے کچھ کم نہیں ہے۔

شادی میں تنوّع پیدا کرنے کی غرض سے بلقیس اور وزیر محمد کا نکاح ٹیلسلسٹ

ایسوسی ایشن کے تنگ و تاریک کمرے میں پڑھا گیا۔ اپنی ٹھوڑی دونوں ہتھیلیوں پر سنبھال کر میں وزیر محمد کے ماتھے پر مچلتی ہوئی خوش نصیبی دیکھ رہا تھا۔ اس وقت ساہنی نے میری کمر میں ٹھوکا دیتے ہوئے پوچھا "صاحب چائے لاؤں"

میں نے مُسکرا کر ایک سگرٹ جلائی۔ آج مجھے مطلق غصّہ نہیں آیا۔ اس وقت شہتیر پر وہ چھپکلی رینگتی ہوئی آئی۔ ہر روز دیکھتے رہنے سے اس چھپکلی سے میری بڑی دوستی ہو گئی تھی۔ بلکہ بلقیس سے مایوس ہو کر تو میں اس چھپکلی سے ہی محبت کرنے لگا تھا اور اس کو بڑے دلآویز نام دے رکھے تھے —— مائی ڈیر چھپکلی —— ڈارلنگ چھپکلی۔

نکاح کے بعد ساتھی بغل والے کمرے میں گئے جہاں بلقیس دُلھن بنی بیٹھی تھی۔ اس کے گرد اس کی سہیلیوں کا جھرمٹ تھا۔ ستاروں کے جھرمٹ سے زیادہ تابندہ۔ کونے کے صوفہ پر بلقیس کی بوڑھی ماں تھی اور اس کی جھرّیوں میں مسکراہٹ! میں دروازے میں ٹھٹک کر رہ گیا۔ یہ کیسا طنز ہے! بلقیس نے وہی جارجٹ کی ساڑھی پہنی تھی جو میں نے اس کے لیے میاں فضل دین کی دُکان سے خریدی تھی —— یہ کیا! —— اور ایسا کیوں؟ مجھے شو پنہار یاد آ گیا۔

بلقیس تمام ساتھیوں کے تحفے مُسکرا مُسکرا کر قبول کر رہی تھی۔ مگر جب مجھے دیکھا تو اس کے گالوں کے کنول مرجھا سے گئے اور آنکھوں پر آنسوؤں کی دُھند سی چھا گئی۔ میں خالی ہاتھ تھا —— اپنی لرزتی ہوئی آواز کو کھنکار کر صاف کرتے ہوئے میں نے کہا "مبارک ہو بلقیس —— تمہاری ازدواجی زندگی چودھویں رات کی طرح چمکتی رہے۔

بلقیس نے مُسکرانے کی ایک نامکمّل کوشش کرتے ہوئے شکریہ ادا کرنا چاہا مگر اس کی زبان کے ہلنے سے قبل ہی میں باہر کے کمرے میں آچکا تھا۔ جہاں بلقیس کے ابّا سگار سُلگانے کی کوشش میں دیا سلائیاں جلا رہے تھے۔

⁂ ⁂ ⁂

اب میری زندگی میں کیا رہ گیا تھا۔ نہ بلقیس اور نہ بلقیس کی اُمیّد۔ میرے دل پر بھوک اور پیسے کے یوں تو بہت زخم ہیں۔ مگر جو کاری گھاؤ عشق کی فسردگی کا لگا تھا۔ اس نے میرے دل میں ویرانی، طبیعت میں اضمحلال اور لمبے جسم میں جھکاؤ سا پیدا کر دیا تھا۔ سارا سارا دن "ایسوسی ایشن" میں بیٹھا رہتا۔ چائے کی پیالیوں پر پیالیاں انڈیل لیتا۔ کاٹن مِل کی چمنی کی طرح میرا مُنہ ہمیشہ سگرٹوں کا دُھواں اُگلتا رہتا۔ اور جب شہتیر پر وہ دوست بلکہ محبوب چھپکلی رینگنے آتی۔ تو میں مسکرانے لگتا۔ حتیٰ کہ مرہٹہ چھوکرا حیران ہو کر کہہ بیٹھتا "صاحب! آج کل آپ کو نہ جانے کیا ہو گیا ہے؟"

وہ لڑکا ابھی نو عمر ہے۔ ابھی اس کو جارجٹ کی ساڑھی کے دام معلوم نہیں۔ اسی لیے میں نے اس کو کوئی جواب دینا مناسب نہیں سمجھا مگر ایک دن وہ خود سمجھ جائے گا کہ انسان کو بعض اوقات نہ جانے کیا ہو جاتا ہے۔ اس کو جارجٹ کی ساڑھی کے دام بھی معلوم ہو جائیں گے۔

بلقیس کی شادی کو پانچ مہینے گزر گئے۔ اور میں یوں محسوس کر رہا تھا جیسے میں ایک بڑا ہی کہن سال بوڑھا ہوں جس نے برسوں پہلے بلقیس کو دلھن بنے دیکھا ہے۔ ایک دن میں اپنی مخصوص عادت کے مطابق دونوں ہتھیلیوں پر سر جھکائے اُونگھ

رہا تھا۔ اور یہ چھوکرا چائے لانے ہوٹل تک گیا تھا کہ چوڑیوں کی ہلکی سی کھنک سے ایسوسی ایشن کی ساری فسردہ فضا کھِلکھلا کر ہنس پڑی۔ بلقیس میرے سامنے کھڑی تھی۔ اس کی آنکھوں میں غم کا دھند لکا تھا اور بیضوی چہرے پر بوڑھیوں جیسی سنجیدگی۔ میں نے کرسی سے اُٹھتے ہوئے کہا "ہیلو۔ بیگم وزیر محمد —— خیریت تو ہے۔ آپ کچھ بیمار نظر آرہی ہیں۔"

بلقیس نے ایک کرسی میرے قریب کھینچ کر پہلے ادھر اُدھر دیکھا۔ جیسے کوئی بڑا راز فاش کرنے والی ہے۔ پھر بولی "ڈیر عارف۔ مجھے معاف کرنا۔ میں نے تمہارے ساتھ بڑی زیادتی کی مگر نہیں —— میں نے کوئی گناہ نہیں کیا میں نے تو صرف محبّت کی۔ پاک اور منزہ محبّت —— اب بھی میں تمہیں دل و جان سے چاہتی ہوں۔ مگر جارجٹ کی ساڑھی نے میری آنکھیں کھول دیں۔ اسی لیے میں نے وزیر محمد سے شادی کر کے ایک مثال قائم کی ہے۔ کہ محبّت اور چیز ہے اور شادی اور چیز۔ محبّت رُوح کی ضرورت ہے اور شادی جسم کی ضرورت ہے . . ."

میں نے اپنی اُبھرتی ہوئی ندامت پر طنز کی بھاری چٹان رکھتے ہوئے جواب دیا "مگر بیگم وزیر محمد —— عورت ہی ایسی مثال قائم کر سکتی ہے۔ مرد تو بس درندہ ہوتا ہے۔"

"عارف —— عارف میں یہ نہیں کہنا چاہتی تھی۔ میں تو . . ."

اس اثنا میں چھوکرا چائے لیے اندر آگیا۔ میں نے پیالی بلقیس کے سامنے پیش کی۔ بلقیس نے پیالی کے کثیف کنارے کو صاف کرتے ہوئے کہا "اچھا چھوڑو اس بحث کو . . . یہ معاملہ تمہاری سمجھ پہ چھوڑے دیتی ہوں . . . مگر ایک

بہت ہی ضروری بات جو تم سے کہنی ہے وہ یہ ہے .... شاید وزیر محمد یہاں آ جائیں۔ مجھے ان سے پہلے گھر پہنچ جانا چاہیے۔ ہاں تو وہ بات یہ ہے کہ جس وزیر محمد کو ہم اپنا ساتھی سمجھ رہے ہیں۔ وہ آستین کا سانپ ہے۔ گورنمنٹ کی ہین، پر جھومنے والا سانپ۔ کل رات کا ذکر ہے۔ میں سوئی نہیں تھی۔ بلکہ یونہی رضائی اوڑھے لیٹی تھی کہ وزیر محمد کہیں باہر سے آئے۔ مجھے سوتا سمجھ کر بڑی دیر تک کچھ لکھتے رہے۔ اور پھر ایک لفافے کو تجوری میں بند کر کے بستر پر لیٹ گئے —— بڑی دیر کے بعد جب وہ گہری نیند میں خراٹے بھرنے لگے۔ تو میں نرم نرم قدموں سے تجوری تک گئی۔ اور اسے کھول کر دیکھا۔ ایک لفافہ پر پولیس کمشنر کا پتہ درج تھا اور تمہارے اس مضمون کی نقل، جو گزشتہ اگست کے بلوے پر اپنے پوشیدہ جلسے میں پڑھا گیا تھا۔ مزاں براں ہمارے بہت سے ساتھیوں کے پتے اور مصروفیتیں اور ہمارے "پوشیدہ پریس" کے متعلق بھی بہت سی معلومات بہم پہنچائی گئی تھیں۔ میں نے جلدی جلدی اسی مضمون کے نیچے وزیر محمد کا نام ٹائپ کر دیا۔ اور ایک گمنام پرچی کمشنر پولیس کے نام لکھ کر سویرے ہی ڈاک میں ڈال دی ہے اور یہ لو وہ پرچیاں جو میں نے اس لفافے سے نکالی ہیں —— میں اب چلتی ہوں۔ دیکھو کسی کو معلوم نہ ہو کہ میں یہاں آئی تھی۔"

بلقیس کوندے کی طرح لپک کر باہر نکل گئی اور میں نے ایک سگریٹ جلا کر شہتیر سے چپکی ہوئی چھپکلی کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا "ہائی ڈیر چھپکلی —— کچھ سنا تم نے؟ —— بلقیس کیا کہہ رہی تھی .... ؟

بے چارہ وزیر محمد —— بلقیسیت تو اب اسی کے خلاف ایک محاذ بن گئی ہے۔

واہ ری عورت!

— یہ کیا عذاب نازل کر لیا اس نے۔ اس کی پھوٹتی ہوئی جوانی تو پالٹیکس سے زیادہ شوہر کی محتاج ہے۔ میری محبت سے زیادہ اس کو اپنے سہاگ کی ضرورت ہے۔ بلقیس — تو نہ فلسفی ہے اور نہ عورت۔ بلکہ ایک طاقت ہے۔ ایک مضبوط کردار — ایک قربانی "۔

چند ہی دنوں بعد وزیر محمد پر گورنمنٹ کو دھوکا دینے کے الزام میں مقدمہ چلایا گیا۔ سب ساتھی عدالت میں موجود تھے۔ میں بھی ایک کونے میں ساہنی کے کندھے پر ہاتھ رکھے وزیر محمد کے جھکے ہوئے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔

گواہی میں جب بلقیس کا نام پکارا گیا تو سب ساتھی حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ اور میں تو یوں محسوس کر رہا تھا۔ جیسے میں زمین پر نہیں کھڑا ہوں بلکہ ایک غیر مرئی سطح پر قدم جمانے کی کوشش میں قلابازیاں کھا رہا ہوں — بلقیس شہتیر پر رینگنے والی چھپکلی کی طرح نیم جان کٹہرے میں آئی۔ اس وقت ساری عدالت پر قبرستان کا دھوکا ہو رہا تھا۔ جیسے بلقیس گواہی دینے نہیں آئی بلکہ ہندوستان کی پرانی رسم ستی کو پھر سے تازہ کرنے آئی ہے۔

بلقیس نے لڑکھڑاتی زبان میں کہنا شروع کیا "میرے شوہر وزیر محمد پانچویں کالم سے تعلق رکھتے تھے۔ مگر انھوں نے محض اپنے ذریعہ معاش کی خاطر گورنمنٹ کی نوکری اختیار کی مسٹر عارف کے نام سے جھوٹی رپورٹیں لکھ کر رات کے سناٹے میں مجھ سے ٹائپ کرواتے تھے اور دوسری طرف خود اندرونی طور پر گورنمنٹ کی بیخ کنی کی خاطر اپنے ان مضامین کے ذریعہ عوام میں زہر پھیلاتے تھے۔ جن کو پولیس کی تلاشی

نے ہمارے گھر سے برآمد کیا ہے۔ میں نے ایک گمنام پرچی کمشنر پولیس کو بھیجی۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ ہماری مہربان گورنمنٹ کے خلاف کسی قسم کی بغاوت کو اُبھرنے دیا جائے۔ بس مجھے کچھ اور نہیں کہنا ہے۔"

عدالت پر ایک سکتہ طاری تھا۔ اور بلقیس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اس نے اپنی بوڑھی ماں کے سینے پر سر جھکا کر ساری فضا میں ایک درد سا گھول دیا تھا۔ اور جب جج نے فیصلے میں وزیر محمد کو تین سال قید بامشقت کی سزا سُنائی تو عدالت شہد کی مکھیوں کے چھتّے کی طرح گونجنے لگی۔ وزیر محمد کو کٹہرے سے اُتارا گیا۔ بلقیس نے ایک لمحہ کے لیے آنکھیں پھاڑ کر اس کو دیکھا۔ دوڑ کر اس سے لپٹ گئی اور اس کے گریبان میں منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اب نہ وہ سیاسی کارکن تھی۔ نہ فلسفی اور نہ محبوب بلکہ صرف بلقیس۔ ایک عورت۔ ایک بیوی۔

شریمہ ساہنی نے اس وقت مجھے جھنجوڑ کر کہا۔ "عارف ۔ واقعی بلقیس تجھ سے محبّت کرتی تھی۔"

ظہیر نے طنزاً کہا۔ "اور دیکھا تم نے ۔۔۔ جارجٹ کی وہی سُرخ ساڑھی پہن رکھی تھی۔"

میں نے ظہیر اور ساہنی کی طرف غضبناک آنکھوں سے دیکھا۔

بیچاری عورت ۔۔ ۔۔ ۔۔ !!

درانتی اور ہتوڑا

"گالی — ماں بہن کی گالی۔

شعلہ بار نگاہوں سے خلا میں دیکھتا ہوا گوپالو بڑبڑایا اور درانتی اُٹھا کر پرے پھینک دی۔ سیٹھ لچھمی نارائن نے آج اس کو سرِ بازار گالی دی تھی۔ گالی اور ماں بہن کی گالی۔ گوپالو ہمیشہ کی طرح شاید یہ گالی بھی تھوک کے گھونٹ کے ساتھ گٹک کر نگل لیتا۔ مگر آج یہ نیک بخت اس کی بیوی سرلا بھی تو وہاں مرنے آگئی تھی۔ اس کی موجودگی میں گالی کھا کر گوپالو کو یہ شدید احساس ہو رہا تھا کہ اب وہ قطعاً گوپالو نہیں ہے۔ ادھر سرلا یہ سوچ رہی تھی کہ سیٹھ کی گالی کی اہمیت ہی کیا ہے۔ جب کہ گوپالو اور گوپالو جیسا ہر انسان گالیاں کھانے کے لیے پیدا ہو۔ — گالیاں کھاتے کھاتے بڑا ہو اور شاید گالیاں کھاتے کھاتے مر بھی جائے۔ ہاں گوپالو پر سیٹھ کے ساٹھ روپے قرض تھے نا! دو روپے ماہانہ سود میں ماں بہن

کی گالیاں بھی تو شامل ہوتی ہیں -
مرد ہر جگہ ذلیل ہو سکتا ہے - لیکن ایک عورت کے آگے ... گوپالو نے سوچا آج یہ اس کی پتنی شاید اسی وجہ سے نڈھال ہے - گوپالو شاید اب اس کی نظر میں گوپالو نہ رہا ہو - ایک کُتا جو گالیاں کھا کر بھی دُم ہلاتا ہوا قدموں میں لوٹتا ہے - لیکن یہ دُم کب تک ہلتی رہے گی ؟ اور سیٹھ نے گوپالو کو گالی دی تھی - اس کی ماں اور بہن کی گالی دی تھی - سرلا کو تو نہیں دی تھی — مگر ایک دن وہ سرلا کو بھی گالی دے گا - اس کے بچّے کو بھی گالی دے گا - ایک گالی سے دُوسری گالی پیدا ہوتی ہے اور اس طرح گالیوں کی ایک فصل کھڑی ہو جائے گی لیکن اس کو تو گیہوں کی فصل کاٹنی ہے - گالیوں کی فصل کاٹنے کی طاقت اس میں کہاں - اس کا گلا رندھ گیا - وہ بے اختیار رو دینا چاہتا تھا تاکہ نجات کا کوئی پہلو نکل آئے - مگر اس کا بچّہ رونے لگا -

"اُوں - اُوں - اُوں - اُوں - ماں بھوک لگی ہے -

ایک اُداس نسوانی آواز سارے گھر کا جگر کاٹ گئی -

بھوک لگی ہے میرے لال کو - ماں کا کلیجہ کھا لے نا -"

یہ جواب سُن کر گوپالو کے تن بدن میں انگارے بھڑک اُٹھے - یہ جواب بھی بلاشبہ ایک گالی ہے - جو نہ اس کی ماں سے متعلّق ہے اور نہ اس کی بہن سے بلکہ خود اس کی ذات کو گالی دی گئی ہے - یہ عورت دن بدن کتنی باغی ہوتی جا رہی ہے - شاستروں میں لکھا ہے کہ عورت مرد کا آدھا جسم ہے — اردھانگنی - مگر کیا غریبی میں مرد بھی کسی کا آدھا جسم ہو کر رہ جاتا ہے - اس کے بچّے کی معصومیّت

نے صرف ایک حقیقت کا اظہار کیا تھا۔ کہ اس کو بھوک لگی ہے۔ اس کا جواب کچھ اور بھی ہو سکتا تھا۔ مگر عورت کے چرتر کو دیوتا اور شو پنہار بھی سمجھ نہ سکے۔ تو گوپالو جیسا سادہ لوح کسان کیا سمجھ سکتا ہے۔ وہ تو صرف اتنا ہی سمجھ سکتا تھا کہ آج سویرے ہی سویرے اُس نے اپنی بیوی کی صورت دیکھی تھی۔ بچہ برابر روئے جا رہا تھا۔ گوپالو کی جھلاہٹ عروج نقطہ پر پہنچ گئی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ اپنی بیوی کو اس کی خطرناک بغاوت کی سزا دینے کے لیے سچ مچ اس کا کلیجہ بھون کر بچے کو کھلا دے۔ بچّے کا رونا تو بند ہو جائے گا۔۔ مگر بعد کو اس کا اپنا رونا جو شروع ہو گا۔ اور بیوی میں زیادہ افادہ ہے یا بچّے میں؟ رونا تو ایک معمولی سی بات ہے۔ بڑے بڑے راجہ اور مہاراجہ بھی روتے ہی پیدا ہوتے ہیں اور زندگی میں بھی روتے رہتے ہیں۔ بڑے بڑے راجہ اور مہاراجوں سے اپنا مقابلہ کر کے گوپالو کچھ کھسیانا سا پڑ گیا۔

اس وقت سرلا اس کا حقّہ لیے اندر آئی۔ گوپالو نے چارپائی سے لٹکتے ہوئے پاؤں اُوپر اُٹھا لیے اور حقّے کی نے ہاتھ میں لیتے ہوئے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ اس کی پیشانی کی شکنیں دُور ہو گئیں اور آنکھوں میں ایک ہلکا سا تبسّم آ گیا۔ گوپالو کی اندھیری زندگی میں تھوڑی بہت رجائیت اسی وقت پیدا ہوتی تھی۔ جب اس کی بیوی حقّہ لیے اس کے پاس آتی تھی۔

گوپالو اس وقت سرلا سے کچھ باتیں کرنا چاہتا تھا۔ ایسی باتیں جو اس کو یقین دلا دیں کہ وہ ابھی تک گوپالو ہی ہے۔

"بچہ بھوک سے رو رہا ہے۔ کیوں سرلا؟"

"ہاں ناتھ۔ دیکھو ایک بات کہتی ہوں بُرا تو نہ مانو گے؟"
اب گوپالو کے کان شکاری کتّے کے کانوں کی طرح کھڑے ہو گئے۔ اس کی بھنویں سُکڑ گئیں۔ اس کی آنکھوں کا وہ رجائی تبسّم غائب ہو گیا۔ "یہ بُرا تو نہ مانو گے" کی نئی شرط کیسی۔ پہلے تو سرلا ہر اچھّی بُری بات کھری کھری سُنا دیتی تھی۔ آج یہ وعدہ کیسا لیا جا رہا ہے۔ اس نے باتیں اس لیے شروع کی تھیں کہ اس کو یقین ہو جائے کہ وہ گوپالو ہی ہے کہیں وہ گالی والی بات تو نہیں۔
"کیا سوچ رہے ہو۔ بولو بُرا تو نہ مانو گے۔ میں صرف یہ کہنا چاہتی ہوں کہ میرا یہ کنگن کہیں بیچ آؤ۔ کب تک پیٹ سے پتّھر باندھے رکھیں۔"
حقّے کی نے گوپالو کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ اس کے پاؤں پھر چارپائی کے نیچے لٹکنے لگے۔ دروازہ سے داخل ہوئی رجائیت خوش رنگ چڑیا کی طرح کھڑکی سے پرواز کر چکی تھی۔
گوپالو نے خلا ہی خلا میں اب سے دور پچھلی زندگی کے چند دن اور چند راتیں دیکھیں۔ جب شادی سے پہلے وہ سرلا کے عشق میں گرفتار تھا۔ سرلا کی محبّت جیتنے کے لیے اس نے چوری کی تھی۔ فرید پور کے میلے سے ایک عیّاش طبع مارواڑی عورت سے جھوٹی محبّت اور ناجائز تعلّقات پیدا کر کے اس کے کنگن چُرا لایا تھا۔ محض سرلا کے لیے ـــ اسی کنگن کے محیط میں سرلا اور گوپالو کی محبّت پیدا ہوئی۔ پھیلی اور پھیل کر دُنیا کے گھیرے سے بھی وسیع ہو گئی تھی۔ اب یہی سرلا کہہ رہی ہے کہ وہ کنگن بیچ دے۔ اس نے سوچا کہ آج صبح سے اس کی بیوی اس کی ذات کو گالیاں دیتی جا رہی ہے۔ ایسی گالیاں جو بیٹھ

لچھمی نارائن کی ماں بہن والی گالیوں سے زیادہ کڑی ہیں اور اتنی ثقیل کہ گوپالو تنور کی دس روٹیاں تو ہضم کر لے مگر یہ ذری سی گالی ہضم نہ کر سکے ایک گالی سے دوسری گالی پیدا ہوتی ہے اس طرح گالیوں کی ایک فصل کھڑی ہو جاتی یہ سوچتے سوچتے اس کا ہاتھ بے اختیار درانتی پر جا پڑا۔ درانتی کے آہنی قوس کو دھیرے دھیرے بائیں ہتھیلی پر مار مار کر سوچنے لگا کہ کیا کرنا چاہیے اور کیا نہ کرنا چاہیے۔

رات ہو چکی تھی، دفعتاً گوپالو چارپائی پر سے اٹھ کھڑا ہوا اور سرلا سے کہا کہ تمام ضروری سامان باندھ کر تیار ہو جائے کیونکہ وہ آج رات ہمیشہ کے لیے اس گاؤں کو چھوڑ دینا چاہتا ہے۔ سرلا نے متحیر نظروں سے اُسے دیکھا مگر اس نے نرم ہو کر جواب دیا۔ "اری پگلی۔ شہر جائیں گے شہر۔ جانتی ہے شہر کیا ہوتا ہے۔ دھرتی کا سورگ جہاں میرا جانی دوست الہ دین لوہے کے کارخانے میں کام کرتا ہے۔

سرلا نے اپنی پیدائش سے آج تک شہر نہ دیکھا تھا۔ وہ ہمیشہ سُنا کرتی تھی کہ شہر سُورگ کا نمونہ ہوتا ہے۔ سورگ دیکھنے اور جانے کی تمنا کس انسان کے دل میں نہیں ہوتی۔ سورگ کی خاطر ایک انسان کیا کچھ تگ و دو نہیں کرتا ہے۔ سرلا تو ایک عورت تھی۔ تھانے کی اُجلی عمارت کے گھنٹے نے جب دس بجائے اور سارے گاؤں پر اندھیرا نیند اور سناٹا مسلط ہو گئے تو گوپالو کندھے پر گٹھڑیاں اور سرلا اپنے سوتے ہوئے بچے کو کمر پر لادے ایک ہاتھ میں لالٹین لیے جھونپڑے سے باہر نکلے۔

جھونپڑے سے سورگ کی طرف ..

گاؤں کے نالے کے کنارے شیوجی کا ٹوٹا پھوٹا مندر سورگ کے راستے کی ایک منزل تھی۔ گوپالو نے شاہ آبادی پتھروں کے چبوترے پر اپنی گٹھڑیاں اُتار کر رکھ

دیں۔ سرلا کو وہاں بیٹھ جانے کو کہا۔ اور یہ بھی کہا۔
"سرلا۔ میں ایک بہت ہی ضروری چیز بھول آیا ہوں تو ذرا کی ذرا یہیں بیٹھ رہ۔ تیری پلک جھپکنے سے پہلے ہی لوٹ آؤں گا۔
سرلا اس سے کچھ کہنا اور اُسے روکنا چاہتی تھی۔ مگر وہ ایک لمحے میں دائرے سیاہ میں روپوش ہو چکا تھا۔ سرلا نے گھبرا کے اپنے بچّے کو سینے سے چمٹاتے ہوئے سوچا کہ زیور گہنوں کی پٹاری، کپڑوں کی گٹھڑی، شادی کا ٹرنک سبھی کچھ تو موجود ہے پھر وہ کیا چیز بھول آیا ہے؟
"کھٹ کھٹ۔ کھٹ۔ کھٹ کھٹ۔"
گوپالو سیٹھ لچھمی نارائن کے دروازے پر پہنچ گیا اور محسوس کر رہا تھا۔ جیسے علی بابا ڈاکوؤں کے خزانے تک پہنچ گیا ہے۔ صرف "کھل جا سم سم" کہنے کی دیر ہے۔ سیٹھ لچھمی نارائن گاؤں والوں کی ساری دولت لوٹ کر اس مکان میں یکہ و تنہا رہتا تھا۔ لُٹے ہوئے غریبوں کی بددعاؤں سے اس کی بیوی اور بچّہ دونوں مر چکے تھے۔ مگر ابھی لچھمی نارائن زندہ تھا۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ بھوک کی بدولت غریبوں کی آہوں میں بھی اتنی نقاہت پیدا ہو گئی تھی۔ کہ وہ آسمان تک پہنچنے سے پہلے گھر کی نیچی نیچی چھتوں سے ٹکرا کر لوٹ آتی تھیں اور لچھمی نارائن کا ایک بال بھی بیکا نہ ہو سکا۔ آج گوپالو پر ایک نئی حقیقت واضح ہو گئی تھی کہ خالی خولی بددعاؤں سے کیا حاصل؟ تقدیر کا کیا قصور؟ انسان کے پاس ابھی جرأت تدبّر تو ہے۔ گوپالو کے پاس درانتی تو ہے اور درانتی کا کام صرف — فصل کاٹنا ہی نہیں بلکہ ...

کھٹ کھٹ ۔ کھٹ ۔ کھٹ کھٹ

گوپالو نے دوبارہ دستک دی۔ اندر سے کوئی کھانسا اور بلغم کا ایک پٹاخہ زمین پر گرا۔
"کون ہے رے" کی بلغمی آواز کے ساتھ دروازہ کھلا سیٹھ لچھمی نارائن کے ایک ہاتھ میں ڈنڈا تھا۔ اور دوسرے میں لالٹین — طاقت ۔ روشنی ۔ اور پیسہ — ادھر غربت، درانتی اور نیا احساس — جانے کیا ہونے کو ہے؟

"کون گوپالو ۔ کیا کام ہے رے اس وقت۔"

"سیٹھ ایک بڑی ضروری بات ہے۔ دیا کرو۔ مجھے اندر لے چلو۔ ساری رام کہانی سُنا دوں گا۔" سیٹھ کے جواب کا انتظار کیے بغیر گوپالو اندر ہو گیا۔ اور خود ہی دروازہ بند کر کے چٹخنی لگا دی — اب گوپالو نے ہر طرف سے مطمئن ہو کر اپنی ساری مسکینی ایک غرّاہٹ کے ساتھ حلق سے نکال دی۔

"اب بتاؤ سیٹھ۔ کیا حال چال ہیں؟"

"ارے ارے گوپالو۔ ہٹ! یہ سر پر کیوں چڑھا چلا آ رہا ہے۔ بات تو سُن۔ آخر چاہتا کیا ہے؟"

"سیٹھ۔ میں ذرا ماں بہن کی گالی کھانا چاہتا ہوں۔ بھوک لگی ہے۔"

سیٹھ نے موقع کی نزاکت اپنی کرنجی آنکھوں سے دیکھ لی۔ اور ہمت جمع کر کے اپنے نوکر کو آواز دی۔

"بھولا ۔ ارے بھولا۔"

"اب بھولے کو کیا آواز دیتے ہو سیٹھ وہ تو اپنے جھونپڑے سے باہر بھی نہیں نکل سکتا۔ میں نے سب بندوبست پہلے ہی کر لیا ہے۔"

سیٹھ جیسے ٹھنڈا پڑ گیا ہو۔ اس نے مکاری سے لہجہ بدل کر کہنا شروع کیا۔
"گوپالو۔ یہ تجھے کیا ہو گیا ہے۔ کیا مجھے بھول گیا تو۔ میں نے تیرے ساتھ تو تیرے ماتا پتا سے زیادہ احسان کیے ہیں۔ ارے میں تو تجھے اپنے بیٹے جیسا سمجھتا ہوں۔" گوپالو متاثر ہونے کے بجائے مسکرا دیا۔
"ہاں سیٹھ جی کیا کہنا ہے۔ مگر یہ تمہارا دلاتی جنتر منتر اب مجھ پر نہ چل سکے گا۔ وہ دن گئے جب تم نے اپنا یہ منتر پڑھ کر پھونکا کہ میری پیٹھ پر دُم اُگ آئی اور میں دُم ہلاتا ہوا تمہارے پیروں میں لوٹنے لگا۔ یہ دیکھ رہے ہو۔ سیٹھ جی! کیا ہے؟" گوپالو نے لال ٹین کی روشنی میں اپنی درانتی سیٹھ کی آنکھوں کے سامنے چمکائی۔ سیٹھ کی پتلیاں ناچنے لگیں۔ اور سارا جسم کانپنے لگا۔
"ارے۔ ارے تو۔ تو چاہتا کیا ہے؟
"ماں بہن کی آبرو کی قیمت لینے آیا ہوں۔"
"ارے پھر منہ سے تو کچھ بول۔ یہ درانتی پرے ہٹا۔ چالیس پچاس؟" گوپالو نے مسکراتے ہوئے کہا
"نہ چالیس نہ پچاس۔ ایک دم ڈیڑھ سو روپے۔ ماں بہن کی گالی سستی تھوڑی ہوتی ہے۔ سیٹھ جی؟"
"اور۔۔۔ وہ پہلے کے روپے اور سود؟ سیٹھ نے جی کڑا کر کے پوچھ لیا۔
گوپالو نے بڑے ذمہ دارانہ طریق پر سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔
"ساٹھ روپے۔ سود۔ ڈیڑھ سو روپے۔ سب ادا ہو جائیں گے۔ سیٹھ گھبراتے کیوں ہو۔ چلو اب جلدی کرو۔"

سیٹھ نے لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے چل کر تجوری کھولی۔ ڈیڑھ سو روپے گوپالو کے حوالے کیے۔ اور ایک رسید پر گوپالو نے مسکراتے ہوئے سیاہی میں بھیگا انگوٹھا بھی لگا دیا۔ جیسے وہ سیٹھ سے بڑا ہی شُستہ مذاق کر رہا ہو۔

"سیٹھ اب میں چلتا ہوں۔ مگر دیکھو تمہارے دروازے پر پورا ایک گھنٹہ کھڑا رہوں گا۔ اگر تم شور مچاؤ گے تو اس درانتی سے تمہارا سر الگ کر دوں گا۔ تم شاید یہ سمجھتے ہو کہ میں جیل سے ڈرتا ہوں۔ اجی جیسی یہاں ویسی وہاں۔ مگر تمہیں تو زندہ نہ چھوڑوں گا۔ اچھا۔ رام رام۔"

سیٹھ کی آنکھوں کے آگے موت ناچ رہی تھی۔ اس کے گلے سے آواز تو آواز ہلکی سی کھانسی بھی نہ نکل سکی۔ گوپالو دبے دبے قدم باہر نکلا۔ دیواروں کے سایہ میں دبکتا چھپتا چھپاتا شیوجی کے مندر پہنچا۔ لالٹین کی روشنی میں سرلا بیٹھی اُونگھ رہی تھی۔ گوپالو کی آہٹ سے چونک پڑی۔ گوپالو کی باچھیں کھلی ہوئی تھیں۔ لالٹین کی بتّی کو اونچا کرتے ہوئے اس نے ڈیڑھ سو روپوں کی تھیلی سرلا کی گود میں پھینک دی۔ سرلا کی آنکھیں حیرت اور ایک طرح کے خوف سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اُس نے اپنے ہاتھ کو تلوار کی طرح جنبش دیتے ہوئے گوپالو سے آنکھوں ہی آنکھوں میں پوچھا۔ گوپالو نے مسکرا کر صرف اتنا کہا۔ "نہیں پگلی"۔۔۔ سرلا ایک بڑی زود فہم عورت تھی۔ وہ مطمئن ہو کر سمجھ گئی۔ کہ گوپالو کون سی چیز بھول آیا تھا۔

(۲)

پو پھٹتے پھٹتے گوپالو اور سرلا بمبئی پہنچ گئے۔ بمبئی نہیں سورگ۔ اونچے اونچے محل جگ مگ جگ مگ کرنے والی دکانیں چمکیلی موٹریں۔ رنگ برنگی ٹرامیں آئینہ جیسی

چمکتی سڑکیں۔ سرلا اپنے آپ سے پوچھ رہی تھی کہ کہیں وہ خواب تو نہیں دیکھ رہی ہے۔ اس سوال میں اس کی سادہ لوحی کو بہت کم دخل تھا۔ کیونکہ بمبئی ایک خواب ہی تو ہے۔ جاگتی آنکھوں کا خواب۔

گوپالو چلتے چلتے تھک گیا تھا مگر سرلا نہ تھکی۔ اگرچہ سڑک شیطان کی آنت کی طرح لمبی ہی لمبی چلی گئی تھی۔ وہ سورگ کے نظارے میں اتنی محو تھی کہ اس کو یہ خیال ہی نہ رہا تھا کہ اس کے جسم میں پاؤں بھی ہیں۔

گیارہ بجے کہیں جا کر الہ دین کا گھر ملا۔ چھٹی کا دن تھا۔ اس لیے الہ دین گھر پر ہی موجود تھا۔ وہ بیس بتیس سالہ گٹھے ہوئے جسم کا مضبوط آدمی تھا۔ بڑی بڑی نوکدار مونچھیں اور گلے میں پڑی ہوئی سیاہ تعویذ نے اس کے بشرے پر طاقت کی مستی سی پیدا کر رکھی تھی۔ اور آنکھوں میں لاابالی پن ——— ایسا لاابالی پن جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ الہ دین اپنی زندگی کو کوئی اہمیت ہی نہ دیتا ہو یا وہ نہ تو ایک اچھی زندگی کی آرزو رکھتا ہے اور نہ ایک بہت بُری زندگی سے بددل ہے۔

گوپالو کو دیکھتے ہی ایک غیر اختیاری تبسّم نے الہ دین کے ہونٹوں میں وسعت اور آنکھوں میں چمک پیدا کر دی اور وہ بھیّا کہتا ہوا گوپالو سے لپٹ گیا۔ اور اتنی دیر تک لپٹا رہا کہ محبّت کی گرمی سے دونوں کی آنکھوں میں آنسو اُتر آئے۔

رُوکھی سُوکھی روٹی کھانے کے بعد گوپالو اور سرلا سستانے کے لیے لیٹ گئے۔ مگر سرلا کروٹ پر کروٹ بدل رہی تھی۔ جیسے بے چین ہو گئی ہو۔ گوپالو نے سرلا کو پہلے پہل متحیر نظروں سے دیکھا اور بالآخر پوچھ بیٹھا۔

"تُو کچھ پریشان نظر آتی ہے۔ سرلا کیا بات ہے؟"

"ہاں ناتھ۔ میں سوچتی ہوں کہ اگر سیٹھ تھانے میں رپورٹ لکھا دے تو کیا ہوگا؟"

"ارے بس اتنی سی بات۔ تُو تو بس دیوانی ہے۔ سورگ پہنچ جانے کے بعد کیسا ڈر۔ بھگوان کے پاس بھی تو ایسا ہی ہوتا ہے، جو کچھ سوال جواب ہوتا ہے وہ سورگ میں آنے سے پہلے ہی ہوتا ہے۔ سورگ نہیں تو نرک۔ اب تو ہم سورگ میں ہیں اور سیٹھ تو تھانے تک بھی نہ گیا ہوگا۔ یاد ہے پچھلی بیساکھ میں جب امّو جاٹ نے سیٹھ کی سونے کی انگوٹھی چُرالی تھی تو تھانیدار نے رشوت میں سیٹھ سے انگوٹھی کی قیمت سے زیادہ روپے وصول کیے تھے۔ تھانیدار بڑا کائیاں ہے وہ جانتا ہے کہ ننگے اور بھوکے رامو کو پیٹنے کے سوائے تھانیدار کو اور کیا فائدہ ہو سکتا ہے تو سیٹھ نے رامو کو چھوڑ تھانیدار کو گالیاں دینی شروع کر دیں تھیں۔

ہی ہی ہی ..... ہا ہا ہا۔ الہ دین حُقّہ کا دُھواں نتھنوں سے چھوڑتا ہوا قہقہے لگانے لگا۔ "بھئی خوب رہی۔ خوب۔ خوب۔"

اب گوپالو اور سرلا الہ دین کے گھر ہی رہنے لگے اور الہ دین نے کارخانے کے بڑے بابو سے کہہ سُن کر گوپالو کو لوہا کوٹنے کی اور سرلا کو بڑے بابو کے گھر برتن مانجھنے کی نوکری دلا دی۔ الہ دین خود اکیلا آدمی تھا اور مست زندگی گزارنے کا قائل۔ اس کی تنخواہ بمبئی جیسے شہر کیلیے اتنی قلیل تھی کہ اس نے شادی کا خیال ہی دل سے نکال دیا تھا اپنی سیدھی سادھی زندگی کو شادی کی مہنگی عورت کی زلفوں میں اُلجھانا نہ چاہتا تھا۔ وہ ایک سستی عورت کا قائل تھا جو کوئل کی طرح امبوا کے پیڑ پہ کچھ دیر کُوکے اور پھر اُڑ جائے۔ ایک "ہمیشہ" کی عورت کو وہ زندگی کا ایک مُستقل روگ سمجھتا تھا۔ گوپالو نے بھی ایک دن جب اُسے گھر بسانے کی رائے دی تو وہ ہنس پڑا۔

"بھیّا۔ میرا گھر ہی کہاں ہے میں تو امبوا کے پیڑ پہ رہتا ہوں اور کبھی کبھی کُوکتا ہوں۔ ہاہاہا ہی ہی ہی۔

اور اسی شام کو الہ دین گوپالو کو سفید گلی سے لیے گزرا۔ گوپالو نے یوں تو آوارہ عورتیں اپنے گاؤں میں بھی دیکھی تھیں مگر عورت کا بازار عمر بھر میں پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ یہ دیکھ کر اسے بمبئی کا سورگ نرک سے بھی زیادہ بھیانک نظر آنے لگا۔

اسی مشاہدے کے بعد سے گوپالو کچھ پریشان پریشان رہنے لگا۔ جیسے اس کو یہ وہم ہو گیا ہو کہ سرلا بھی ایک کوئل بن گئی ہے۔ وہ سرلا کو بڑی مشتبہ نگاہوں سے دیکھتا۔ سرلا جب پانی کا گھڑا لیے میونسپلٹی کے نل پر جاتی۔ سرلا جب رفع حاجت کے لیے سرکاری سنڈاس جاتی۔ سرلا جب آدھی دیوار والے غسل خانے میں نہاتی۔ سرلا جب بڑی رات گئے بڑے بابو کے گھر سے لوٹتی۔

آخر ایک دن اس نے الہ دین سے اپنے دل کا حال کہہ دیا۔ الہ دین بمبئی میں پیدا ہوا تھا۔ اور بمبئی کی فضا میں منجھ کر بڑا ہوا تھا۔ اچھے اچھے غنڈے اس کے سامنے بغلیں جھانکتے تھے۔ اس نے گوپالو کی پیٹھ پر اپنا ہاتھ ٹھونکتے ہوئے کہا۔

"بھیا"! الہ دین اُستاد کے ہوتے ہوئے کیا مجال کوئی سالا بھابی کی طرف بُری نگاہ سے دیکھے۔ گودا نہ نکال کے رکھ دوں سالے کا۔"

"یہ ٹھیک ہے بھیا۔" گوپالو نے جواب دیا۔ مگر سرلا دو روز سے یہ کہہ کر مجھے پریشان کر رہی ہے کہ وہ اب بڑے بابو کے گھر برتن مانجھنے نہیں جائے گی۔ بڑے بابو اسے چھیڑا کرتے ہیں۔ ان کی بیوی میکے گئی ہیں نا۔ ان کی بوڑھی ماں کے سوائے گھر میں کوئی نہیں ہے۔ کل شام بڑے بابو نے سرلا کو دس روپے کا ایک نوٹ بھی دینا چاہا۔ سرلا نے لینے سے انکار کر دیا۔ میں تو سرلا کو وہاں جانے سے منع بھی کر دوں۔ اگر بڑا بابو نوکری سے نکال دے تو پھر کیا ٹھکانا ہمارا۔ اگر کوئی دوسری نوکری مل جائے

تو آج ہی چھوڑ دوں۔

الہ دین پتھر کا بُت بنا سب کچھ سُن رہا تھا۔ اور بالآخر گہری سانس کے ساتھ گوپال کو جواب دیا۔

"بڑے بابو کو میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ اپنی آدھی سے زیادہ تنخواہ عورتوں اور دواؤں پر خرچ کرتا ہے۔ مگر بھابی کو نوکر رکھاتے وقت میں نے بڑے بابو سے کہا تھا کہ بڑے بابو اس کو بھی کہیں ایسی ویسی نہ سمجھ لینا۔ مگر سالے نے پر نکالنے شروع کر دئے۔ ہوں۔ ایسے بھیّا۔ یہ بڑا بابو تو مجھ سے تھر تھر کانپتا ہے۔ اس کی ساری ہسٹری میں خوب جانتا ہوں۔ پچھلی ہڑتال میں میں نے سالے کی موٹر بیچ بازار میں روک لی تھی۔ سارے مزدور میرے انڈر میں تھے۔ معاملہ فضلو کی جوان لونڈیا کا تھا۔ اب سالے کی نیّت میری بھابی پہ آئی ہوئی ہے۔ اچھا سمجھ لُونگا۔ تُو بے فکر رہو گوپال۔

اسی شام کارخانے سے لَوٹتے ہوئے الہ دین بڑے بابو کی کوٹھی پر گیا۔ اس کے ہاتھ میں لوہے کا وزنی ہتوڑا تھا۔ وہ جوں ہی پھاٹک میں داخل ہوا۔ اسے ایک عورت کی ہلکی ہلکی دبی دبی چیخیں سُنائی دیں۔ وہ ٹھٹک کر رکا اور پھر تیزی سے سیڑھیاں چڑھتا اوپر پہنچ گیا۔ بڑے بابو کے سونے کے کمرے کی دہلیز پر اس نے اپنی آنکھوں سے وہ ناٹک دیکھ لیا جس کا قصّہ گوپال نے اسی دن سویرے ہی سویرے الہ دین کو سُنایا تھا۔ سرلا نے اپنے سیدھے ہاتھ سے دروازے کی چوکھٹ مضبوطی سے پکڑ لی تھی اور اس کا بایاں ہاتھ بڑے بابو کے ہاتھ میں تھا جس کو وہ بڑی طاقت سے اندر کھینچ رہا تھا۔ بڑا بابو شراب کے نشے میں بڑا بابو نہ رہا تھا۔ بلکہ بورژوائی شہوت مجسّم بنا ہوا تھا۔

الہ دین غرّایا۔" بڑے بابو سرلا کو چھوڑ دو۔ الہ دین آچکا ہے۔
بڑا بابو چونک پڑا۔" کون۔ الہ دین۔ یُو ای ڈیٹ۔ تم نے یہاں آنے کی جرأت کیسے کی؟ فول۔ ڈیول"۔ بڑے بابُو نے سنگار دان کی میز سے ایک پستول نکالا الہ دین موقع کی نزاکت محسوس کر کے اس پر جھپٹ پڑا۔ بڑی ہاتھا پائی کے بعد جب بڑے بابو نے پستول ہاتھ سے نہ دیا تو الہ دین نے بڑے بابو کے چمکدار بالوں والے سر پر اپنے ہتوڑے کا ایک بھرپور وار کیا۔ اور بڑے بابو کی تیس سالہ زندگی ایک ہی چیخ کے ساتھ جسم سے باہر نکل گئی۔

(۳)

اسی رات پولیس نے الہ دین کو گرفتار کر لیا۔ اور جب پانچویں دن سویرے ہی سویرے اسے عمر بھر کے لیے جیل میں ٹھونسا جا رہا تھا۔ اس نے کارخانہ کے ہزاروں مزدوروں کے سامنے گوپالو کو سینے سے لگاتے ہُوئے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا۔
"بھیّا! کبھی تم نے کہا تھا کہ" درانتی کا کام صرف فصل کاٹنا ہی نہیں بلکہ اس سے اپنی لُوٹی ہوئی دولت بھی واپس لی جا سکتی ہے۔ آج میں تم کو ایک بات اور بتاتا ہوں کہ ہتوڑے کا کام صرف لوہا کُوٹنا ہی نہیں بلکہ بڑے بابو ... ہی ہی ہی ... قی قی قی۔"

الہ دین بے اختیار ہنسنے لگا۔

گوپالو۔ سرلا اور تمام مزدوروں کی آنکھیں نمناک تھیں اور دھرتی پر نئی صبح کا اُجالا پھیل رہا تھا۔

آدم خور

کسی زمانہ میں اسی ملک میں ایک بادشاہ حکومت کرتا تھا۔ وہ اتنا عادل اور منصف مزاج تھا کہ اس نے کبھی شیر اور بکری کو ایک گھاٹ پر پانی نہیں پینے دیا تاکہ کہیں پانی پینے کے بہانے شیر بکری کو ہڑپ نہ کر جائے۔ وہ اتنا رعایا پرور تھا کہ اس کی ساری رعایا فاقے کرتی ننگی رہتی اور بھوکوں مرتی تھی، عام بادشاہوں کی طرح اُسے مقبرے اور قبریں بنانے کا بڑا شوق تھا۔ اس کا جمالیاتی ذوق اتنا شُستہ تھا کہ اُس کی سلطنت کی ساڑھے تین سَو خوبصورت پریجمال اور آئینہ رُو عورتیں اس کے حرم میں رہتی تھیں۔ جو ایک ایک دو دو بار شاہی خلوت کی آرائش بنیں اور پھر ہمیشہ کے لیے جوانی کی آگ میں جلنے کے لیے چھوڑ دی گئیں۔ پُرانے بادشاہوں کی طرح اسے بھی بڑی اچھی اچھی غذائیں کھانے کا بہت شوق تھا۔ وہ وقتِ واحد میں ایک سَو آدمیوں کا کھانا کھا جاتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے ہر کھانے پر ایک سَو

آدمی مر جاتے تھے۔ اپنے اباؤ اجداد کی طرح اس کو بھی ناچ رنگ اور شراب و کباب کا بہت شوق تھا۔ کباب تو خیر وہ بہت کم کھاتا —— مگر شراب بہت پی جاتا تھا اور اتنی پیتا تھا کہ محل کی ساری عورتوں کے درمیان ننگا ناچا کرتا تھا۔ مگر کسی عورت یا کسی مصاحب یا رعایا میں اتنی مجال نہیں تھی کہ وہ ہنسی تو ہنسی ذرا سی مسکراہٹ بھی اپنے ہونٹوں پر لا سکتی۔ کیونکہ وہ بادشاہ تھا۔ یعنی ظل اللہ —— یعنی خدا کا سایہ۔ یعنی .. .. ؟

بادشاہ اپنی رعایا کی اس وفاداری سے بہت خوش تھا۔ خوش کیسے نہ ہوتا۔ جب تک رعایا میں گھٹنے ٹیک کر جھک جانے کی عادت تھی۔ اس وقت تک، وہ بادشاہ تھا بادشاہ۔

مگر ایک دن گھٹنے ٹیکی ہوئی رعایا میں سے ایک بوڑھا عالم تن کر سیدھا کھڑا ہو گیا اور بولا —— "نہیں نہیں —— میں بادشاہ کے آگے کیوں اپنے گھٹنے ٹیکوں۔ وہ بھی تو میری طرح ایک انسان ہے۔ اس کے بھی میری طرح ہاتھ پاؤں، آنکھ، ناک، کان، آنتیں، کہنیاں اور گھٹنے ہیں۔ پھر وہ بادشاہ کیوں اور میں جمال محمد کیوں ہوں —— میں بادشاہ کو نہیں مانتا۔

بادشاہ کے مصاحبوں نے جمال محمد عالم کی یہ بات سنی تو دوڑے دوڑے شاہی محل گئے اور سانس روک کر۔ سر جھکا کر عرض کیا۔

"جہاں پناہ —— جان کی امان پائیں تو عرض کریں۔"

بادشاہ نے خاص بلغم آلود بادشاہی لہجہ میں فرمایا۔ "حکم ہے۔"

مصاحبوں نے جمال محمد عالم کی ساری باتیں عرض کر دیں۔ بادشاہ کو بہت غصّہ آیا۔

غصّہ کے مارے اس کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ مُنہ میں سفید سفید کف آ گیا۔ تھوڑا سا کف اس کی بڑی بڑی مونچھوں پر بھی لگ گیا۔ اور اس نے جانور کی طرح چنگھاڑ کر حکم دیا۔ "جمال محمد کو فوراً پھانسی دے دو۔"

جمال محمد کو اسی شام پھانسی دے دی گئی۔ اس کے بعد سے رعایا پر بادشاہ کے غصّہ کی ایسی ہیبت طاری ہو گئی کہ رعایا بادشاہ سے شیطان سے بھی زیادہ ڈرنے لگی۔

پُرانے بادشاہوں کی طرح اسے بھی سیر و شکار کا بہت شوق تھا۔ عورتوں اور جانوروں کے شکار میں اس کا ڈنکا چار دانگ عالم میں بج رہا تھا۔ شکار کیلیے بادشاہ کو ایسی ایسی مصیبتیں اُٹھانی پڑتی تھیں کہ بعض بعض اوقات پورا پورا دن مچان پر بیٹھے بیٹھے اس کو جمائیوں کی ڈاک سی لگ جاتی اور تھک کر چُور ہو کر وہ افیون کھاتا اور فارسی غزلیں کہتا۔ شکار کا ہانکا کرنے والے دیہاتی شکار کو اتنی دیر میں ہانک کر لاتے تھے کہ بادشاہ کو اتنا غصّہ آجاتا کہ اس کا جی چاہتا کہ شکار کے بجائے اپنے ان دیہاتیوں کو گولی کا نشانہ بنا دے لیکن چونکہ وہ دیہاتی بغیر گولیوں ہی کے مرتے جا رہے تھے اور اس کی رعایا بھی، اس لیے بادشاہ اپنے غصّے کو دبا لیتا۔ ——دیہاتی شکار کا ہانکا کر کے شکار کو بالکل اس کے مچان کے قریب لے آتے۔ بلکہ بعض دیہاتی تو شکار کو زخمی بھی کر دیتے۔ تاکہ شکار ادھ مُوا ہو جائے یا بالکل مر جائے۔ اس کے بعد بادشاہ بندوق اُٹھاتا۔ اور ٹھائیں سے شکار کو مار دیتا۔ شکار اگر ادھ مُوا ہوتا تو پُورا مر جاتا۔ اگر مرا ہوا ہوتا تو دوبارہ مرتا۔ اس کے بعد بادشاہ مچان سے اُتر کر نیچے آتا اور شکار کے جسم پر ایک پاؤں اور بندوق کا کندا ٹیک کر بڑی تمکنت سے کھڑا ہو جاتا —— شاہی

فوٹوگرافر سامنے آکر جھک کر فرشی سلام بجالاتا۔ اور ایک عدد تصویر کھینچ لیتا۔ پھر وہ تصویر مُلک کے اخباروں میں شائع ہوتی۔ اور ساری دُنیا میں غوغا مچ جاتا کہ واہ واہ وا ـــــ بادشاہ کے مسئلۂ شکار پر مشہور درباری ادیب رئیس الادبا آغا ہرمز قرمز نے "تذکرۂ شکار شاہی" کے نام سے ایک مستقل کتاب تصنیف کی ہے۔ اس تصنیف کے باب ہفتم میں صفحہ ۳۶۲ پر آغا ہرمز قرمز ایک بڑا دلچسپ واقعہ تحریر کرتے ہیں:

"ایک بار بادشاہ جہاں پناہی کسمنڈو کے جنگلوں میں شکار کے لیے تشریف لے گئے۔ جنگلی ہاتھی کا شکار مقصود تھا۔ بادشاہ سلامت اور بادشاہ سلامت کے مُنہ چڑھے مصاحب حضرت شیخ معجونی بندوقیں لیے پہر دن چڑھے سے مچان پر متمکن جنگلی ہاتھی کا انتظار کھینچ رہے تھے۔ دُوسرے سارے مصاحب اس جنگلی ہاتھی کا ہانکا کرنے جنگلوں میں بھٹک رہے تھے۔ ہاتھی جنگل میں گھومنے کے بجائے اپنی نئی نویلی ہتھنی کے ساتھ مچان سے بہت قریب ایک تالاب میں غسل کر رہا تھا۔ بعد غسل کے وہ ہاتھی ذرا سیر تفریح کے لیے نکلا۔ تو اچانک اس کی نظر مچان پر پڑی جہاں بادشاہ سلامت اور شیخ معجونی اسی کے منتظر بیٹھے تھے۔ ہاتھی کو بڑا غصّہ آیا۔ اور اپنی نئی نویلی ہتھنی پر رعب جمانے کی خاطر حضور بندگانِ عالی کی طرف دوڑا۔ حضور بندگان عالی نے بندوق اُٹھائی اور دھن سے چلادی۔ مگر گولی جیسے مکھی کی طرح بھنبھناتی ہوئی ہاتھی کے کان کے قریب سے گزر گئی۔ ہاتھی کا غصّہ بھی ہاتھی ہوگیا۔ یعنی بہت بڑھ

گیا اور وہ اپنے حلق کی ساری رگیں پھلا کر زور سے چنگھاڑا ۔
اور اپنی سونڈ سے مچان پکڑ لی ۔ مچان جھولنے لگا اور ٹوٹنے کے قریب تھا ۔ ادھر بندگانِ عالی کی بندوق مبارک خالی تھی ۔ شیخ معجونی کی بندوق البتہ بھری ہوئی تھی ۔ مگر شیخ معجونی پوچھ رہے تھے :

"جہاں پناہ ۔ حکم ہو تو بندوق چلا دوں ۔"

"حضور بندگانِ عالی ـــــ جان کی امان پاؤں تو گولی مار دوں ؟"

حضور بندگانِ عالی کیا حکم دے سکتے تھے ۔ کیونکہ حضور بندگانِ عالی کی پتلون ـــــ خیر اسی اثنا میں ہانکا کرنے والے مصاحب دوڑے دوڑے آئے اور برچھوں اور بندوقوں سے ہاتھی کو مار گرایا ۔ اس کے بعد بادشاہ سلامت نے شیخ معجونی کو پھانسی کا حکم دے دیا ۔ اور اپنی پتلون دھلوانے کے لیے دریا پہ بھیج دی ۔

راوی کہتا ہے کہ جب شاہی پتلون دریا پہ دھل رہی تھی تو ایک نوجوان طرحدار دھوبن پتلون کو دیکھ کر کھلکھلا کر ہنس پڑی ۔ بادشاہ نے اس بدتمیز دھوبن کو بھی پھانسی کے تختہ پر چڑھانے کا حکم عنایت فرمایا ۔

اُس جنگلی ہاتھی ۔ شیخ معجونی اور طرحدار دھوبن کے شکار کے بعد ریاست کے سارے مشّاق سے مشّاق شکاریوں نے اپنی اپنی بندوقیں رکھ دیں کہ جب تک بادشاہ سلامت جیسا شکاری موجود ہے ۔ ہم میں یہ تاب ، یہ سکت ، یہ ہمت کہاں ـــــ ؟

بادشاہ سلامت کے شکار کی ایک اور خصوصیت یہ تھی کہ وہ عام شکاریاں

کی طرح شکاری کُتّے نہیں پالتے تھے۔ بلکہ شکاری کُتّوں کا کام وہ اپنے عہدہ داروں سے لیا کرتے تھے۔ جنھیں حضور نے سارے مُلک میں پھیلا رکھا تھا۔ یہ شکاری کُتّے اصلی شکاری کُتّوں سے زیادہ خونخوار تھے۔ بڑی بیدردی یعنی بڑی چالاکی سے رعایا کی کمائی اور بہو بیٹیوں کا شکار کرتے تھے۔ غرض کہ بادشاہ کا مُلک مُلک نہیں تھا بلکہ ایک بہت بڑی شکارگاہ تھا۔ مشہور چینی سفیر فش چاؤ اپنے سفرنامے میں تحریر کرتا ہے کہ اس بادشاہ کے زمانہ میں فن شکار کو جتنی ترقی ہوئی کسی زمانہ میں نہیں ہوئی۔ بادشاہ تو اس فن میں ایسا طاق اور مشّاق تھا کہ اکثر اوقات وہ بندوق اور دوسرے ہتھیاروں کے بغیر بھی شکار کھیلا کرتا تھا۔ مثلاً ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک گاؤں کے کسانوں نے خشک سالی کی وجہ سے کھیتوں کا لگان دینے سے انکار کر دیا تو بادشاہ کو بہت غصّہ آیا یعنی بادشاہ بہت ہنسا۔ یہ بادشاہ کی خاص عادت تھی۔ جب اسے غصّہ آتا تو وہ زور سے ہنستا تھا اور جب ہنسی آتی تھی تو وہ مُنہ پھلا لیتا ——— آخر کو وہ بادشاہ تھا یعنی ظل اللہ یعنی خدا کا سایہ یعنی۔ جب بادشاہ کا غصّہ تھما یعنی اس کی ہنسی رُکی تو اس نے حکم دیا کہ ان کسانوں کا سارا اناج ضبط کر لیا جائے۔ بادشاہ کے شکاری کتّوں نے یعنی عہدہ داروں نے اپنی اپنی دُم زور زور سے ہلائی اور پھر سارا اناج اپنی دُم کی جھاڑو سے جھاڑ جھاڑ کر محل مبارک میں پہنچا دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اس گاؤں کے سارے کسان روٹی کو ترستے مر گئے۔ جو آدمی کہ جتنے میں آیا وہ موت کے چنگل سے بچ نہ سکا۔ چھوٹے چھوٹے شیرخوار بچّے بلک بلک کر مر گئے۔ نازک نازک عورتیں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر گئیں۔ اس طرح پانچ چھ سو انسان صرف اس لیے مر گئے کہ بادشاہ

کو غصہ آگیا تھا۔ بادشاہ کے انوکھے غصّہ کی تصویریں جب ملک کے اخباروں میں چھپیں تو چار دانگ عالم پر بادشاہ کی ہیبت طاری ہوگئی۔

بادشاہ سلامت کے شکار کا سب سے زیادہ پُر لطف واقعہ تو وہ ہے — وہ آدم خور شیر کے شکار کا واقعہ — واقعہ یوں ہے کہ جھنڈور کے جنگلوں میں ایک شیر آدم خور ہوگیا تھا اور جنگل کے قریبی گاؤں راج پور کے آدمیوں کو پریشان کرنے لگا تھا — اور دس پندرہ آدمی چٹ کر گیا تھا۔

راجپور کے گاؤں کے سب آدمیوں نے چوپال میں بیٹھ کر یہ فیصلہ کیا کہ اس شیر کو مار دینا چاہیے۔ یہ کام گاؤں کے مشّاق شکاریوں کے سپرد کر دیا گیا۔ مگر جب یہ پانچوں نوجوان شکاری بندوقیں برچھے اور تیر کمان لے کر جنگل کی طرف جا رہے تھے تو راستہ میں انھیں سرکاری پیادہ ملا جو شاہی حکم لایا تھا۔ کہ خبردار کوئی اس آدم خور شیر کو نہ مارے — بادشاہ سلامت خود اس کا شکار کرنے تشریف لا رہے ہیں۔

سارے گاؤں میں اس خبر وحشت اثر سے دہشت پھیل گئی اور پانچوں شکاری اپنے اپنے گھر لوٹ آئے۔

ایک دن گزر گیا۔ بادشاہ سلامت تشریف نہیں لائے۔ مگر ظلِ الٰہی نے کھیت پر ہل چلاتے ہوئے ایک کسان کو ہڑپ کر لیا۔

دوسرا دن گزر گیا۔ سواریٔ شاہ نہیں آئی۔ مگر بادشاہ جہاں پناہ ایک ریوڑ ہانکنے والی نوجوان لڑکی کو چیر پھاڑ کر کھا گئے۔

تیسرا دن گزر گیا جہاں پناہ نہیں آئے۔ مگر ڈونگر کے قریب جہاں پناہ

نے ایک پردیسی مسافر کو نگل لیا۔

چوتھا دن گزر گیا۔ بندگان عالی کے قدوم میمنت لزوم کے لیے گاؤں بیتاب ہو رہا تھا مگر بندگان عالی نے ایک چرواہے لڑکے کو نوالہ بنا لیا۔

گاؤں والے پریشان ہو گئے۔ کہ اب کیا کیا جائے۔ شیر کے ظلم یا بادشاہ کے انتظار کی ایک حد ہوتی ہے —— یا حد ہوتی ہی نہیں —— نہیں نہیں ایسے کام نہیں چلے گا۔ ایسی کی تیسی۔ یہ کہہ کر مادھو کسان کا نوجوان لڑکا شامو چوری سے بندوق لے کر چھپتا چھپاتا جنگل کی طرف چلا —— ابھی وہ پٹواری کے کھیت تک بھی نہ پہنچا تھا کہ اسے ایک طرف ڈونگر میں شیر کے چنگھاڑنے کی آواز آئی۔ اور دوسری طرف سے بادشاہ سلامت کی سواری مبارک آتی نظر آئی۔ اب شاموں پریشان ہو گیا کہ وہ کس کو مارے۔ دونوں میں سے کونسا شیر زیادہ خونخوار ہے؟

جب سواری جہاں پناہی بہت قریب آگئی تو مرتا کیا نہ کرتا۔ شامو نے بندوق کی نال حضور پرنور کی طرف اٹھا دی۔ ابھی اس کا ہاتھ لبلبی تک بھی پہنچا نہ تھا کہ بادشاہ کے شکاری کتے جھپٹے اور . . . .

اور پھر بادشاہ شامو کی تکا بوٹی نوچتا رہا۔ اور ادھر ڈونگر میں شیر بیچارا بھوک کے مارے چنگھاڑتا ہی رہ گیا ❊

زبیدہ اور ہم تینوں

وہ انگریز لڑکی نہیں تھی۔ ہاں وہ اسکرٹ پہنتی تھی۔ اس کے بال بالکل بھورے تھے اور آنکھیں نیلی اور رخسار سُرخ۔ کبھی کبھی وہ شوخ لال رنگ کی پتلون اور رنگین دھاریوں والی جرسی یا گہرے سبز رنگ کی پتلون اور زرد رنگ کی اسپورٹنگ قمیص بھی پہنا کرتی تھی۔ دیکھنے میں معلوم ہی نہ ہوا کہ وہ مسلمان لڑکی ہے۔ اور جس دن مجھے معلوم ہُوا کہ اس کا نام زبیدہ ہے تو میں بےحد حیران رہ گیا جیسے میرے سامنے ایسی کوئی سچائی ہو جس پر جھوٹ کی اتنی تہیں چڑھ چکی ہوں کہ سچائی سچائی نہ ہو۔ اس لڑکی پر بھی کتنی ہی ایسی تہیں تھیں۔ اس کے سونے کے تاروں جیسے شانوں تک لہراتے بال۔ اس کے ٹماٹر جیسے گال، اس کی نیلی آنکھیں، اس کی اسکرٹیں۔ فراکیں۔ پتلونیں....

اور وہ زبیدہ تھی —— !

زبیدہ کو میں روز دیکھتا تھا۔ زبیدہ کے اور میرے درمیان صرف ایک اٹھارہ فٹ

کی چوڑی سیمنٹ روڈ حائل تھی۔ وہ "مفت لال پارک" کے ایک شاندار سے فلیٹ میں رہتی تھی اور میں اس کے فلیٹ کے عین مقابل میں "زربانو لاج" کے ایک حقیر سے کمرے میں۔ مفت لال پارک زبیدہ کی طرح ایک شاندار اور پُرشکوہ عمارت تھی۔ بمبئی کی سب سے زیادہ خوبصورت عمارت سمندر کے کنارے سائیلینس زون — (Silence zone) میں اس کے سامنے ہمارا زربانو لاج جیسے اپنی ساری بدصورتی کے باوجود مفت لال پارک کا مذاق اُڑاتا تھا جس کے ایک کمرے میں ہندوستان کے تین عظیم المرتبت مفلس یعنی میں اور لدھیانے کا حمید اختر اور ڈیرہ دون کا دیندر رہتے تھے۔ ہم تینوں نہ صرف ایک دوسرے کے گہرے دوست تھے بلکہ ہم تینوں کے عشق کی بھی ایک ہی منزل تھی۔ زبیدہ! خورشید سحر تاب زبیدہ۔ قندیل شب افروز زبیدہ۔ لذّت کائنات زبیدہ، جانِ عالم زبیدہ۔ لالہ رُخ زبیدہ، بیوٹی فل زبیدہ۔ ونڈرفل زبیدہ!!

تو زبیدہ اس بُری طرح ہمارے دل و دماغ، ہماری آنکھوں اور ہمارے خوابوں پہ چھائی ہوئی تھی۔ ہمیں اس کا جسم بےحد پسند تھا۔ اس کا سُرخ و سپید چمکدار جسم — صرف جسم۔ میری ایک شدید ترین خواہش یہ تھی کہ ایک بار صرف ایک بار وہ جسم مجھے مل جائے تو پھر میرا جسم زندگی بھر کے لیے نہال ہو جائے۔

ہم تینوں زبیدہ کو بڑی نظروں سے گھورا کرتے تھے۔ جب وہ فلیٹ کے اندر ہوتی تب بھی ہم کھڑکیوں اور دروازے پر اپنی نظریں لگائے رکھتے کہ ممکن ہے وہ کبھی دروازے پر آجائے۔ ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں جاتے ہوئے کھڑکی سے نظر آجائے۔ ایک جھلک — ایک طور۔

اس طرح ہمارے اور اس کے روزمرّہ پروگراموں میں بڑی مطابقت سی پیدا ہو گئی تھی۔ ہر روز صبح ساڑھے نو بجے اپنی بالکونی میں بیٹھ کر ہم ناشتہ کرتے تھے۔ تو ادھر سامنے مفت لال پارک کی بالکونی میں زبیدہ بلا ناغہ اپنی فراکیں اپنے ڈریسنگ گاؤن اپنی قمیص لکڑی کے چھوٹے چھوٹے کلپوں سے لگا کر دھوپ میں سکھانے کے لیے تار پر لگا دیتی تھی ——— اور پھر جب ہم اپنے اسٹڈیو کو جانے کے لیے بس اسٹاپ آتے، تو وہ بھی ہماری مخالف سمت کے بس اسٹاپ پر کالج ——— کی لاری کا انتظار کرتی۔ شام کو ——— کالج سے واپس آ کر وہ رنگ برنگے اسکرٹ پہن کر اپنے چھوٹے سے کالے کتّے کے پٹّے کی زنجیر تھامے ——— برنچ کینیڈی اسکنڈول پوائنٹ پر سیر کرنے چلی آتی جہاں کی بنچ پر ہم تینوں پہلے ہی سے بیٹھے اس کا ——— انتظار کرتے تھے۔ کبھی کبھی اس کی انگریز ماں اور موٹا توندیل ہندوستانی مسلمان باپ بھی اس کے ساتھ ہوتا۔ مگر وہ اکثر اکیلی ہی ہوتی۔ سنیچر کی دوپہر اور اتوار کا سارا دن زبیدہ کا پروگرام بدل جاتا ——— سنیچر کی شام جب کہ بمبئی کی سڑکوں پر ہالی ڈے اٹ! اسفر طاری ہو جاتا اور ساری بمبئی اور بمبئی کا سارا حسن ——— سڑکوں، ہوٹلوں، سینماؤں، پارکوں اور سمندر کے ساحلوں پر نکل آتا ——— جانے زبیدہ کہاں چلی جاتی ——— رات بڑی دیر تک اس کا فلیٹ بھی اندھیرے میں ڈوبا رہتا ——— مگر اتوار کی صبح وہ سوئمنگ کا سیوٹ پہنے کندھوں پر نہانے کا تولیہ ڈالے برنچ کینیڈی کے سوئمنگ پول چلی جاتی۔ سڑک پر چلنے والے اس کی ننگی سُرخ و سپید مسکولر رانوں اور پنڈلیوں کو بڑی حسرت

سے بڑی للچائی نظروں سے گھورتے تھے۔ سوئمنگ پول میں خوب ——
تیرنے، جی بھر کر نہانے کے بعد وہ مفت لال پارک کے وسیع لان پر
اپنے بال سکھانے آجاتی۔ اس کا —— ملازم ایک بڑی سی رنگین چھتری لان
میں گاڑ دیتا اور اس چھتری کے سائے میں وہ ایک آرام کرسی —— پر لیٹے
لیٹے شاید ناولیں پڑھتی —— یا پھر اپنے کتے کے پلّے کے ساتھ کھیلتی رہتی۔
لان کی —————— نرم نرم گھاس پر لوٹتی رہتی۔ اس وقت وہ
نیم عریاں ہوتی —————— ایک اونچی سی اودی نیکر پہنے اور
چھاتیوں پر کوئی رنگین سا رومال کسا ہوا —— اور بس ——
ان چھوٹے چھوٹے کپڑوں میں اس کا حسن —— بلکہ اس کا جسم ——
خوب نکھر آتا۔

اس وقت زبیدہ ہمارے لیے ٹکنیکل فلم کی امریکن ایکٹریس کی طرح
دلچسپ اور پُراسرار معلوم ہوتی تھی اور اس سے ہم اسی طرح مایوس ہو
جاتے جس طرح —— کہ ہم "ڈورتھی لامار" سے مایوس ہیں۔

مگر جس دن سے ہمیں مفت لال پارک کے —— سکھ چوکیدار بھائی
اجل سنگھ سے —— معلوم ہوا تھا کہ وہ انگریز نہیں ہے ——
زبیدہ ہے تو ہمیں ایک لمحہ کے لیے ایسی خوشی ہوئی تھی کہ جیسے ہم نے اسے
پالیا ہو۔ حالانکہ ڈیڑھ ماہ کے عرصہ میں ایک بار بھی ہماری طرف آنکھ اٹھا کر
نہیں دیکھا تھا —— اس کو شاید معلوم نہیں تھا کہ زریانو لاج کے فلیٹ پر
چھ آنکھیں ایسی بھی ہیں جو مسلسل ڈیڑھ ماہ سے اس کے جسم کی

نکھری شستھری جلد کو میلی کر رہی ہیں ـــــ اگر بالفرض زبیدہ نے ہم لوگوں کی طرف کبھی دیکھا بھی ہوگا، تو ایسے ہی دیکھا ہوگا۔ جیسے سڑک پر سے آتے جاتے ـــــ لوگوں کو ـــ یعنی دیکھا بھی ـــــ اور نہیں بھی دیکھا۔ اور ویسے ہی ہم تینوں کی شکل و صورت میں ایسی کوئی خاص بات ـــ نہیں تھی ـــ کہ زبیدہ جیسی خوبصورت ـــــ جوانی ہمیں دیکھے تو بس دیکھتی ہی رہ جائے ـــــــ ہم تینوں کو اپنے آپ پر بے حد غصّہ تھا۔

میں اتنا بدصورت اور کم رُو کیوں ہوں ـــــ ؟ میں سوچتا۔ میری ناک اتنی لمبی کیوں ہے ـــــــ ؟

دیندر سوچتا:

میرے چہرے پر اتنے مہاسے کیوں ہیں ـــــ ؟

حمید اختر سوچتا:

مگر جب ہم اپنے اسٹڈیو میں مسخرے کردار رحمٰن کو اپنی عجیب و غریب شکل کے ساتھ اس کی گڑیا ـــــ جیسی خوبصورت ثریّا کو جو رحمان کے عشق میں جالندھر سے بمبئی آگئی تھی ـــــ دیکھتے تو ہمیں ایک امید سی بندھ جاتی ـــ اور ہم کہتے کہ کیا بات ناممکن ہے اس دُنیا میں ـــ انسان کی ڈو یچرس زندگی میں جو لغت تیار کی ہے۔ اس میں "ناممکن" کا لفظ کہاں ہے ـــــ ہاں زبیدہ ایک مشکل عورت ضرور تھی ـــــ لیکن ہم اس کو ایک آسان عورت ـــــ بنا دینے کی خاطر گھنٹوں

پھروں آپس میں صلاح مشورے کرتے، روز نئی نئی اسکیمیں بناتے ——— توڑتے ——— پھر بناتے پھر توڑتے ——— کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کریں تو کیا کریں۔

حمید اختر نے تو بس مفت لال پارک کے ——— ساتھ چوکیدار بھائی اجل سنگھ سے دوستی گانٹھ لی تھی کہ ممکن ہے کہ وہ ——— کوئی سبیلِ عشق پیدا کر دے۔ حمید ٹیلیفون کرنے کے بہانے یار بار مفت لال پارک جاتا ——— بھائی اجل سنگھ کو دو چار آنے روز دے دیتا ——— اس سے گھنٹوں پنجابی میں باتیں کرتا۔ اجل سنگھ کے کہنے پہ ہر تیسرے دن اس کی سردارنی کو ایک خط لکھ دیتا۔ حمید نے اپنے آپ کو بھائی اجل کا ہم وطن بنا لیا تھا ——— حالانکہ حمید لدھیانے کا رہنے والا تھا۔ اور بھائی اجل سنگھ سیالکوٹ کا متوطن تھا ——— مگر عشق میں ایسی بھی تو ایک منزل آتی ہے۔

دیہ ندر ہر روز زبیدہ کی تعریف میں ایک انگریزی گیت لکھتا۔ اور رابرٹ ٹیلر کے انداز میں لہرا لہرا کر گاتا۔

اور میں ———

میں ذہن میں ہزاروں اسکیموں کو رکھنے کے باوجود اور بیچ میں اٹھارہ فٹ ——— چوڑی سڑک حائل ہونے کے باوجود ——— زبیدہ کے سامنے آ کر "نروس" ہو جاتا۔ اسی کشمکش و پیچ میں میری یا اس کی بس آجاتی ——— دونوں چار بجے

تک کے لیے ایک دوسرے سے جُدا ہوتے ۔

ایک دن ہم تینوں نے ہمّت کی کہ آج ضرور —— کوئی نہ کوئی مؤثّر اقدام کرنا چاہیے —— عواقب و انجام کا کیا ڈر ہے ۔ جب کہ سر پھوڑنا ٹھہرا ۔ آج ہو جائے وہ جرأت اندازہ ہو جائے جس کے لیے عرصے سے —— ہم اپنے دلوں میں —— قوت جمع کر رہے تھے ۔
یہ طے کر کے میں باہر بس اسٹاپ پر آکر کھڑا ہو گیا ۔ اور اس کے چند ثانیوں بعد زبیدہ بھی وہاں آ گئی —— اس وقت اپنی بنائی ہوئی اسکیم اور اپنی مجوّزہ جرأت رندانہ کے تحت مجھے زبیدہ کے قریب جانا چاہیے تھا —— اور اس سے ٹائم پوچھنا چاہیے تھا —— اور ٹائم معلوم کرنے کے بعد اس سے کہنا چاہیے تھا —— کہ یہ بس والے بڑے لاپرواہ ہوتے ہیں —— بس کے انتظار میں ہم لوگوں کی بے بسی کا کتنا بُرا عالم ہوتا ہے اور —— دیکھیے نا —— کہ وقت کا کتنا خون ہوتا ہے —— غرض اس طرح کی اور باتیں . . .

اس گفتگو سے تو یہ ہوتا ہے کہ وہ کوئی نہ کوئی جواب دیتی —— پھر اس طرح باتیں بڑھتیں —— آج تھوڑی باتیں ۔ کل زیادہ باتیں اور پرسوں دوستی ۔

دوستی ! ہائے ہائے دوستی ۔

میں بس اسٹاپ پر کھڑا تھا ۔ سامنے زبیدہ کھڑی تھی ۔ اس کی

خوبصورت کلائی پر کالے ریشمی فیتے والی خوبصورت ـــــ گھڑی تھی۔ پانچ گزر گئے ـــــ دس منٹ گزر گئے ـــــ پندرہ منٹ گزر گئے ـــــ سترہ منٹ گزر گئے ـــــ بس آئی۔ وہ بس میں چڑھ گئی ـــــ بس روانہ ہو گئی اور میں شکست کھا کر پھر زربانو لاج کی بالکونی میں آ گیا۔ حمید اور ویربندر بڑی بے تابی سے میرا انتظار کر رہے تھے۔ مجھے داخل ہوتا دیکھ کر دونوں نے بہ یک زبان ہو کر پوچھا۔

"اینی گڈ نیوز ـــــ ؟"

میں نے چارپائی پر گرتے ہوئے کہا۔

"سوری (Sorry)

حمید اور ویربندر غصّے سے بڑبڑانے لگے ـــــ ڈانٹنے لگے ـــــ کہنے لگے۔

تم بزدل ہو ـــــ ڈرپوک ہو ـــــ تم یہ عشق نہیں کر سکتے۔ ـــــ تم یہ عشق نہیں کر سکتے ـــــ تم اس عشق کو استعفیٰ دے دو ـــــ ہمارے راستے سے ہٹ جاؤ۔ ـــــ تمہارے ہٹ جانے سے ایک رقیب تو کم ہو جائے گا۔

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چارپائی پر لیٹے لیٹے کیپسٹن کے لمبے لمبے کش لیتا رہا اور سوچتا رہا۔

اس کے بعد ایک ایک بار ویربندر اور حمید نے بھی زبیدہ کی

بارگاہ حسن میں داخل ہونے کی کوشش کی اور ناکام رہے ——
یہ شاید ہمارے عشق کی ناپختگی تھی۔ شاید ہمارا عشق خام تھا۔
ورنہ عشق تو آتش نمرود میں بے خطر چھلانگ لگا دینے کا عادی ہے۔

اور پھر ایک دن ہم نے اپنی کم ہمتی، بزدلی اور نروس بریک ڈاؤن کا اچھی طرح جائزہ لینے کے بعد یہ طے کر لیا۔ کہ وہ زبیدہ نہیں ہے —— گریٹا گاربو ہے، جین آرتھر ہے —— بٹی ڈیوس ہے —— نارما شیرر ہے ——
اور جب تک ہمارے دلوں میں ذرا سی بھی بزدلی ہے۔ وہ ہمارے لیے گریٹا گاربو یا نارما شیرر ہی رہے گی۔

مگر جس دن ہم زبیدہ سے سخت مایوس ہو چکے تھے۔ وہی دن دراصل بڑا پر امید دن تھا۔ وہ دن جو ہماری زندگی کا بڑا ہی رومانوی دن تھا —— وہ اتوار کا دن تھا۔ سہ پہر کا وقت تھا۔
زبیدہ برنچ کینڈی کے سوئمنگ پول سے تیر کر نہا کر نکلی تھی۔ وہ ایک خوش رنگ پھولوں کا گون پہنے ہوئے تھی —— اس کے سنہرے بال کچے تھے۔ بھیگے ہوئے تھے۔ اور اپنے ننھے سے کالے پلے کی زنجیر گھسیٹے اپنے فلیٹ کی طرف جا رہی تھی۔ ہم تینوں بھی ریستوران سے چائے پی کر باہر نکلے تھے —— اور اس کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے —— عشق تو ختم ہو چکا تھا مگر تعاقب ضرور باقی تھا —— جیسے اگر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی۔ اس وقت

اچانک صوفیہ گرلز کالج کے پھاٹک سے ایک بڑا سا چتکبرا بُلڈ اگ دوڑتا ہُوا نکلا۔ اور زبیدہ کے پلّے کی طرف بھونکتا ہُوا جھپٹا —— زبیدہ بے حد پریشان ہوگئی۔ اس کا پِلّا ڈر کے مارے کیں —— کیں —— کیں چیخنے لگا۔ ہم تینوں اس بُلڈ اگ کی طرف دوڑے۔ حمید اور وِیرندر نے اُسے مار بھگایا —— اور میں نے دوڑکر سگِ لیلیٰ —— یعنی زبیدہ کے پلّے کو گود میں اُٹھا لیا۔ جو ڈر کے مارے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اب زبیدہ کے چہرے پر بھی پریشانی نہیں تھی۔ اس کے نہائے ہوئے سُرخ سُرخ گال دہک اُٹھے تھے —— اس کی نیلی آنکھوں میں تشکّر و اطمینان کی جھلک سی آگئی تھی۔ میں چونکہ شیروانی پہنے ہوا تھا —— اس لیے اُس نے بڑے میٹھے لہجے والی اُردو میں کہا۔

"آپ کا بہت بہت شکریہ —— آپ کو بڑی زحمت —— ہوئی۔"

میں نے گُتّے کے پلّے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے —— بوکھلا کر جواب دیا۔

"نہیں۔ نہیں اس میں شکریہ کی بات ہی کیا ہے —— یہ تو انسانی فرض ......"

"انسانی فرض —— !" زبیدہ نے چونک کر پوچھا۔ اور بے اختیار ہنس پڑی اور بولی۔

"اچھا اسے اب نیچے تو چھوڑ دیجیے۔"

میں جھینپ گیا اور پلّے کو گود سے اُتارتے ہوئے بولا۔

"مگر یہ تو ڈر کے مارے بُری طرح کانپ رہا ہے۔"

زبیدہ جواب میں صرف مسکرائی۔ میری طرف دیکھ کر مُسکرائی۔ مگر وہ حمید اور ویریندر نے خواہ مخواہ دانت کھول دیئے۔ جیسے زبیدہ اُن کی طرف دیکھ کر مُسکرائی ہو —— بے وقوف کہیں کے۔

اب ہم اس کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ کُتّوں اور کُتّوں کی نسل اور کُتّوں کی لڑائیوں کی باتیں کرتے ہوئے تھوڑی ہی دیر بعد مفت لال پارک کا گیٹ آگیا۔ اور میں نے کہا۔

"اچھا ہمیں اب اجازت دیجیے۔ اب آپ کی اور ہماری دونوں کی منزلیں آگئی ہیں۔"

زبیدہ نے کہا:

"ہاں آپ لوگ بھی تو یہیں سامنے رہتے ہیں نا۔ زر بانو لاج میں، اچھا آپ پسند کریں تو آئیے میرے پاس چائے پیجیے نا۔"

ہم نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا کہ یہ ہم کیا سُن رہے ہیں۔ زبیدہ نے در اصل چائے کی دعوت بھی مجھی کو مخاطب کر کے دی تھی مگر وہ دونوں رقیب بیچ میں ٹپک پڑے۔

"ارے آپ کو خواہ مخواہ تکلیف ہوگی۔"

زبیدہ نے کہا۔

نہیں نہیں ـــــ اس میں تکلیف کی کیا بات ہے۔ میں تو اس وقت چائے پینے ہی ہوں۔ سوئمنگ باتھ سے آ رہی ہوں نا ـــــ!"

وہ آگے آگے چل رہی تھی اور پیچھے ہمارے قدم خوشی کے مارے جانے کیسے پڑ رہے تھے۔ گیٹ پر حمید کا دوست سکھ چوکیدار بھائی اجل سنگھ بڑی حیران نظروں سے ہمیں دیکھ رہا تھا۔ حمید نے اس کے قریب سے گزرتے ہوئے اس کے جملے دہرائے کہ:

"پاشا ہو ـــ ایس کُڑی دے نال عشک کرنا جندڑی تباہ کرنے برابر ہے۔ او اسمان تے رہندی ہے۔ ہور تسی دھرتی دے بندے ہو۔ میں کہیا باج آؤ ایس عشک توں۔"

اُجل سنگھ حیران تھا۔ آنکھیں جھپک جھپک کر اور داڑھی پر ہاتھ پھیر پھیر کر ہمیں دیکھ رہا تھا۔

زبیدہ ہمیں ڈرائنگ روم میں بٹھا کر دو منٹ کی اجازت لے کر کپڑے بدلنے اندر چلی گئی۔ اور ہم اپنی پہلی فتح پر کھسر پھسر کرنے لگے۔ پانچ منٹ بعد زبیدہ اودے اسکرٹ اور چمکیلی زرد باڈی والا فراک پہنے طلوع ہوئی اور چائے آنے اور چائے پینے تک ہم کتوں سے لے کر ایکٹرسوں تک ہر موضوع پر باتیں کرتے رہے اور جب ادب کا ذکر آگیا تو زبیدہ نے کہا۔

"مجھے اُردو افسانے بہت پسند ہیں۔"

میں دل ہی دل میں چیخا۔ وہ مارا۔ دریندر نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"اور انگریزی شاعری کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟"
زبیدہ نے کہا۔

انگریزی شاعری نوجوان کیٹس تک ہی تھی۔ اب تو اوٹ پٹانگ ہو کر رہ گئی ہے۔

اس جواب سے ویرمدر کا چہرہ بجھ گیا مگر میرا دل تو کھل اٹھا کہ چلو ایک رقیب تو راستہ سے ہٹ گیا۔ اب حمید اختر باقی رہ گیا ہے۔ مگر حمید اختر کی مجھے کیا پڑا ہے۔ مہاسوں سے اس کا چہرہ انناس کی طرح پھولا ہوا ہے۔ میں تو آج سے بدصورت بھی نہ رہا۔ اور تو اور زبیدہ کو اردو افسانے بھی بہت پسند ہیں۔ یعنی میرا سر کڑھائی میں ہے واہ وا۔

اس تھوڑی سی انکو جمنٹ سے میں زبیدہ سے ذرا کھل کر باتیں کرنے لگا۔ ایسی باتیں جو زبیدہ کے لیے بڑی افسانوی اور دلچسپ تھیں۔ اس مختصر سی ملاقات میں زبیدہ مجھ سے ایسی دلچسپی لینے لگی کہ جب اس کی انگریز ماں کسی ضرورت سے ڈرائنگ روم میں آئی تو اس نے میرا تعارف کرایا کہ: ممّی۔ ہی اِز مائی بوائے فرینڈ، اے ویری انٹرٹیننگ کنورسیشنلسٹ۔"

میں نے بڑے فخر سے اپنے دونوں ساتھیوں کی طرف دیکھا اور جب اُن سے نظریں ملیں تو بڑی تمکنت سے میں نے منہ پھیر لیا۔

تھوڑی دیر بعد جب ہم چائے پی کر باہر نکلے۔ باہر نکلتے وقت زبیدہ نے مجھ سے وعدہ لیا کہ میں کبھی کبھی اس کے پاس آیا کروں اور ساتھ ہی ساتھ یہ وعدہ بھی کیا۔ کہ کبھی کبھی وہ بھی زربانو لاج کی حقیر سی بالکونی کو اپنے چہرے سے پھوٹتی ہوئی چاندنی عطا کرے گی۔

ہم تینوں جب زربانو لاج آئے تو میں خوشی سے پھُولا نہ سما رہا تھا اور میرے دونوں رقیب مجھ سے بگڑے ہوئے تھے۔ وہ میرا مذاق اڑانے لگے۔

رقیب نمبر (۱) "سالے نے اس کے کُتّے کا پِلّا گود میں اُٹھا لیا۔"

رقیب (۲) "اور تم نے نہیں سُنا اُس نے اس کا کیسا مذاق اُڑایا۔"

رقیب (۱) "چھچھورا ہے سالا۔"

رقیب (۲) "خوشامد کرتا ہے عشق کیا کرے گا۔"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ کھڑے ہو کر تقریر کرنی شروع کر دی کہ:
"انگریزی شاعری تو بس جان کیٹس کے ساتھ ہی ختم ہو گئی۔ اب تو اوٹ پٹانگ ہو کر رہ گئی ہے مگر اُردو افسانہ مجھے بہت پسند ہے۔ ممی۔ ہی اِز مائی بوائے فرینڈ۔ اے ڈیری۔

یہ انگارے دونوں رقیبوں کو خاکستر کرنے کے لیے کافی تھے —— اور ہم تینوں میں بڑی سخت لڑائی ہوئی۔

مگر شام کو جب اچانک زبیدہ ہمارے زربانو لاج آئی تو ہم تینوں باوجود اپنی سخت لڑائی کے اس کی مہمان نوازی میں ایک دوسرے کا ہاتھ بٹانے لگے۔ مہمان نوازی کیا بس کچھ یونہی سی مفلس خاطر مدارات —— میں نے حمید اختر کو ریستوران بھیج دیا کہ وہ وہاں سے کچھ کریم پفس۔ کیک پیسٹری، بسکٹس وغیرہ وغیرہ لے آئے۔ ہمارا نوکر کہیں باہر گیا ہوا تھا۔ اس لیے ویرندر نے چائے بنانے کا انتظام اپنے ذمّے لیا اور میں دُنیا کا واحد خوش قسمت عاشق بیٹھا زبیدہ سے باتیں کرتا رہا۔ اس کے بعد کچھ دنوں تک کبھی کبھی میں اس کے پاس جاتا رہا۔ اور کبھی

کبھی وہ میرے فلیٹ کو زینت بخشتی رہی۔

پھر ایسا ہوا کہ میں روز روز اس کے پاس جانے لگا۔ اور وہ روز روز میرے فلیٹ میں آتی رہی۔

زبیدہ سے میری یہ بڑھتی ہوئی دوستی میرے دونوں رقیبوں کو بہت ناگوار تھی۔ اس لیے جب زبیدہ ہمارے فلیٹ میں آتی تو وہ دونوں بھی ہمارے ساتھ آ بیٹھتے تھے۔ گفتگو میں شامل نہیں مخل ہوتے تھے۔ ان کی یہ مداخلت میرے لیے حد درجہ بیہودہ تھی اور شاید زبیدہ کے لیے بھی ـــ مگر زبیدہ کے چہرے مہرے سے باوجود کوشش کے میں کبھی یہ پتہ چلا ہی نہ سکا کہ اس کو بھی ان کی یہ مداخلت ناگوار ہے یا نہیں۔

ویسے زبیدہ بڑی خوش اخلاق لڑکی تھی۔ زندگی کا ایک انگریزی معیار رکھنے کے باوجود، شاندار سے فلیٹ میں رہنے کے باوجود، کوچوں پر بیٹھنے کی عادی ہونے کے باوجود وہ ہماری چارپائیوں۔ لکڑیوں کی کرسیوں اور تین مختلف رنگ کی چائے کی پیالیوں والے مفلس فلیٹ میں بڑی بے تکلفی سے آتی۔ چارپائی پر بھی بیٹھتی۔ لکڑی کی تکلیف دہ کرسیوں پر بھی بیٹھتی۔ ہماری پیالیوں میں چائے پینے میں بھی اُسے کوئی اعتراض نہ تھا۔

زبیدہ جتنی خوبصورت تھی اتنی ہی اچھی لڑکی تھی۔ نہ صرف دل موہ لینے والی خوبصورتی بلکہ دل مسخر کرنے والے اخلاق۔

زبیدہ کا یہ بڑھا ہوا میل جول ہم تینوں کے لیے غلط روی کا باعث تھا۔ ہم تینوں الگ الگ یہ سوچتے تھے کہ اس کو صرف مجھ سے عشق ہے اور ہم بڑی

بیتابی سے منتظر تھے کہ اس عشق کی منزل کہاں ہے اور کب آئے گی؟

ایک بار مجھے بڑا سنہرا موقع ہاتھ لگا۔ میں فلور فونٹین کے راڈ بس سے اکیلا سوار ہوا ۔۔۔ بیحد اداس تھا ۔۔۔ جیب میں صرف دس آنے پیسے اور کیپسٹن کی آدھی ڈبیا باقی رہ گئی تھی ۔۔۔ جب بس چرچ گیٹ کے اسٹاپ پر رُکی تو اچانک مجھے زبیدہ نظر آگئی ۔۔۔ پہلی نظر میں میں اسے پہچان ہی نہ سکا کہ زبیدہ ہے۔ انگریزی لباسوں میں کھیلنے والی زبیدہ آج پہلی بار پنجابی شلوار ۔۔۔ قمیص اور دوپٹہ میں ملبوس تھی ۔۔۔ مجھے دیکھتے ہی مسکرائی اور بس میں سوار ہو کر میرے برابر بیٹھ گئی۔ مجھ سے پوچھا۔

"کہاں جا رہے ہو ۔۔۔ ؟"

میں نے جواب دیا۔

"نہیں معلوم کہاں جا رہا ہوں۔ فلورا فونٹین سے سوار ہوا ہوں۔ ابھی تک فیصلہ نہیں کر سکا کہ مجھے کہاں جانا ہے؟"

زبیدہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تمہاری یہی باتیں مجھے بہت پسند ہیں۔ اچھا تو پھر آج میرے ساتھ چلو۔ میں تمہیں بتاؤں گی کہ کہاں جانا ہے؟"

میں ایک دم چونک اُٹھا ۔۔۔ کیا زبیدہ آج مجھے بتا دے گی کہ مجھے کہاں جانا ہے؟

کیا آج عشق کی آخری منزل آجائے گی۔

دل میں جب مسرّت آگیں تذبذب کی موجیں ۔۔۔ لہریں مار رہی تھیں۔

اور پھر رات کے آٹھ بجے تک زبیدہ مجھے بسوں میں لوکل ٹرینوں میں اور ہوٹلوں میں —— یہے یہے پھرتی رہی —— اور پھر جب ہم آٹھ بجے گرین ہوٹل پہنچے تو زبیدہ نے مجھے لذیذ ڈنر کھلایا —— بل ادا کرتے وقت میں نے خواہ مخواہ اپنے صرف دس آنے والے جیب میں ہاتھ ڈالا اور جیب الٹ کر دس آنے گرین ہوٹل کی شاندار میز پر پھیلا دیئے۔ زبیدہ قہقہہ مار کر ہنس پڑی اور محبّت سے میرے گال پر ایک ہلکا سا طمانچہ لگا کر کہا۔

"Silly"

پھر زبیدہ نے اٹھارہ روپے کچھ آنے کا بل ادا کیا —— اور اس کے بعد خود ہی پروگرام بتایا کہ چلو۔ اب کف پریڈ چلیں۔ کف پریڈ کا ساحل مجھے بہت پسند ہے۔

گرین ہوٹل کے باہر آکر زبیدہ نے ٹیکسی منگوائی اور ہم کف پریڈ کے ساحل پہنچ گئے ٹیکسی میں زبیدہ مجھ سے اتنی قریب بیٹھی تھی کہ اس کے جسم کا گداز —— اس کے جسم کی مہک —— اس کے انفاس کی گرمی نے میرے جسم کے حیوان کو جگا دیا تھا۔ کف پریڈ کے ساحل پر ہم ایک ہی بنچ پر بیٹھے تھے۔ ہوا بہت تیز چل رہی تھی —— سمندر کی موجوں میں تلاطم تھا۔ اور میرے جذبات بھی متلاطم تھے۔ آج زبیدہ کی موجودگی میں میرا احساس کمتری بھی نہ جانے کہاں غائب تھا —— زبیدہ بڑی دلچسپ بڑی میٹھی میٹھی باتیں کر رہی تھی —— مگر میں جیسے کھویا ہوا تھا۔ میرا ہاتھ زبیدہ کے جسم سے بڑی بڑی ناقابل معافی گستاخیاں کر رہا تھا۔ مگر زبیدہ خاموش

تھی —— پھر وہ وقت بھی آگیا کہ میرا ذہن و دماغ معطل ہوگیا۔ زبیدہ کی باتیں میرے کانوں سے ٹکرا تو رہی تھیں —— مگر وہ کیا کیا کہہ رہی تھی۔ کچھ بھی نہیں معلوم —— اور اس کے بعد جب اچانک زبیدہ اُٹھ کھڑی ہوئی اور کہا کہ :

چلو —— اب گھر چلو بہت دیر ہو گئی ہے —— مگر میں نے بڑی مضبوط گرفت —— سے زبیدہ کو کھینچ کر بٹھالیا اور بڑی بیتابی سے بولا۔

زبیدہ —— خوبصورت زبیدہ —— تم اب تک نہ جانے کیا کیا کہتی رہی —— میں کچھ بھی نہ سن سکا۔ مگر اب میری سنو —— تم اگر بُرا نہ مانو —— تم اگر ناراض نہ ہو —— تو وہ بات میں تم سے کچھ کہہ دینا چاہتا ہوں۔ اور —— اور وہ —— بات یہ ہے کہ تمہارا جسم بہت خوبصورت ہے ۔ اور یہ رات ۔ یہ رات ۔

زبیدہ نے بڑے گہرے صبر و سکون سے میری باتیں سُنیں ۔ ایک لمحہ تک اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اور پھر بڑے اطمینان سے بولی ۔

مجھے افسوس ہے کہ میں تمہاری خواہش پوری نہیں کر سکتی۔ مجھے اپنے جسم سے بہت محبّت ہے۔ بے اندازہ محبّت۔ اچھا آؤ چلو —— اب گھر چلیں۔ اگر تمہیں جسم کی واقعی شدید ضرورت ہے تو لو —— اس کے دام میں دے دیتی ہوں۔ بمبئی جیسے حسین شہر میں تمہیں مجھ سے بھی زیادہ خوبصورت جسم مل سکتے ہیں۔

وہ بنچ سے اُٹھ گئی۔ اور میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اُٹھالیا۔ زبیدہ نے مجھے تھپڑ تو نہیں مارا تھا لیکن مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے زبیدہ نے یقیناً مجھے ایک

تھپڑ لگا دیا ہے۔ جب ہم ٹیکسی میں سوار ہوئے تو پھر نارمل حالت میں آگئی۔ وہ پہلے کی طرح ہنسی مذاق کی باتیں کرتی رہی۔ جیسے کچھ بھی تو نہیں ہوا۔ مگر میں خاموش تھا۔ بہت محجوب تھا۔

اپنے فلیٹ پر پہنچ کر میں نے سارا واقعہ اپنے دونوں رقیبوں کو سُنا دیا۔ اس کے بعد مجھے معلوم ہُوا۔ میرے دونوں رقیب بھی الگ الگ زبیدہ کے ساتھ کلب پریڈ کی سیر کر چکے ہیں۔ اور زبیدہ ہاتھ اُٹھائے بغیر دونوں کو تھپڑ ـــ لگا چکی ہے۔

میں رات بھر سوچتا رہا۔ کہ کیا فی الواقع عورت اور مرد میں جنسی تعلقات کے بغیر بھی گہری دوستی برقرار رہ سکتی ہے۔ اور اگر ایسا ہے تو زبیدہ ایک مکمل عورت ہے۔

اس کے بعد کچھ دنوں تک ہم زبیدہ سے بڑے محجوب اور بڑے محتاط طریقے پر ملتے رہے۔ اب زبیدہ ہمارے لیے ایک خوبصورت لڑکی نہیں بلکہ ایک معمّہ بنی ہوئی تھی۔

اور پھر اچانک ایک دن زبیدہ ہمارے فلیٹ پر آئی۔ میرے دونوں رقیب غائب تھے۔ میں بہت خوش ہوا مگر میری خوشی فوراً ہی مر گئی۔ جب زبیدہ نے کہا۔

میں آج فرنٹیر میل سے دہلی جا رہی ہوں پپا نے اچانک میری شادی کی تاریخ مقرر کر دی۔ اور چلو یہ بھی اچھا ہوا۔ میرا منگیتر بہت خوبصورت اور بڑا جولی آدمی ہے۔ تم اس سے مل کر بہت خوش ہو گے۔ میں دہلی پہنچ کر تم تینوں کو الگ الگ دعوت نامے بھیجوں گی۔ ضرور آنا ـــ ورنہ مجھے دُکھ

ہوگا۔ تم تینوں مجھے بہت پیارے ہو۔ اپنے عزیزوں سے بھی زیادہ پیارے نہ جانے کیوں۔"

میں نے بڑے آزردہ لہجے میں کہا۔

زبیدہ تم واقعی جا رہی ہو؟ اچھا تو جاؤ۔ اپنی شادی پر میری مبارکباد قبول کرو۔ زبیدہ تم بہت یاد آؤ گی۔ تمہارے ساتھ ہنس بول کر زندگی کے یہ جو چند دن گزارے ہیں، اس کے لیے شکریہ۔

زبیدہ یک لخت سنجیدہ ہو گئی اور جانے کیوں اس کی خوبصورت آنکھوں میں آنسو اُمنڈ آئے۔ وہ کہنا کچھ چاہتی تھی۔ مگر اس کے ہونٹ کپکپائے، گلاب کی پتّیاں تھرتھرائیں۔ اور پھر بغیر کچھ کہے وہ واپس چلی گئی۔

اور میں۔ میرا سر جیسے ندامت کے بھاری بوجھ سے جھک گیا تھا۔

کتاب منزل لاہور کے ناول، افسانے اور ڈرامے

ناول

محمود پاشا - صائب عاصمی 1-8-0
وادی - سید نظر زیدی 3-0-0
الناصر - رئیس احمد جعفری 5-0-0
چنگاری - رئیس احمد جعفری 5-0-0
حق و باطل - رئیس احمد جعفری 4-8-0
ٹھوکر - رئیس احمد جعفری 4-8-0
یہ جہاں اور ہے - رشید اختر ندوی 1-12-0
گل رخ - رشید اختر ندوی 4-0-0
ہمزاد - عابدی جعفر 4-0-0
محبت کے سوا - عابدی جعفر 4-0-0
مہیب سائے - عابدی جعفر 5-0-0
دیدۂ تر - عابدی جعفر 4-0-0
بنی احمر کا خواب - عشرت رحمانی 3-0-0
پراسرار لفافہ - قمر نقوی 3-0-0
لہو اور آستین - کمال احمد رضوی 3-0-0
فسانۂ آزاد - رئیس احمد جعفری (تلخیص) 10-0-0
شیریں - سعیدہ مظہر ایم-اے 2-8-0
طلسم ہوشربا - رئیس احمد جعفری (تلخیص) 8-0-0
عورت - رئیس احمد جعفری 4-8-0
مجاہد - رئیس احمد جعفری 5-0-0
دل - رئیس احمد جعفری 6-0-0
ایک مہاجر - رئیس احمد جعفری 4-0-0
درد - رئیس احمد جعفری 2-8-0
پندرہ اگست - رشید اختر ندوی 2-4-0

ایک پہیلی - رشید اختر ندوی 2-0-0
کانٹوں کی سیج - رشید اختر ندوی 2-0-0
اس نے محبت کی - رشید اختر ندوی 2-0-0
عورتیں برا نہ مانیں - علی طاہر جعفری 2-12-0
نئی صبح - سعیدہ مظہر ایم-اے 4-0-0
پل صراط - سعیدہ مظہر ایم-اے 4-0-0
قربانی - مہدی علی صدیقی 4-0-0
اور وہ ناچ رہی تھی - عثمان علیم صدیقی 3-1-0
سنگ دل - یحییٰ صدیقی 2-0-0
ساحل سے پہلے - عابدی جعفر 3-8-0
دیوار - عابدی جعفر 3-8-0
خون - قیسی رامپوری 3-0-0
ہنگامہ - عشرت رحمانی 5-4-0
چور بازار - ابراہیم جلیس 2-12-0
وطن سے دور - مختار معین ظفر 4-8-0
جوزیفین - غلام رسول مہر 2-0-0
حوادث - غازی اسحاق

افسانے

سنگم اور سائے - عبد القدیر شک 1-12-0
فریب نظر - طاہر جمیل ایم اے 1-8-0
چھوٹا خدا - ڈاکٹر عندلیب شادانی 2-0-0
زمین جاگ رہی ہے - ابراہیم جلیس 2-4-0
گورکی کے افسانے - سعادت حسن منٹو 1-4-0
شیشہ و سنگ - مرزا فدا علی خنجر لکھنوی 2-
اتفاقات - مرزا فدا علی خنجر لکھنوی 2-8-0

آنسو - اسلم عارف جالندھری 2-12-0
نیلوفر - حسن عزیز جاوید 2-4-0
ساز فطرت - حسن عزیز جاوید 2-4-0
قسمت - حسن عزیز جاوید 2-4-0
صبر و ضبط - حسن عزیز جاوید 2-4-0
دھڑکتے دل - اختر شیرانی 3-0-0
اوراق پارینہ - شیر جنگ 1-8-0
نوش و نیش - ڈاکٹر عندلیب شادانی -8-0

ڈرامے

انجام حیات - سید آل رسول قطبی 1-4-0
ملکۂ ہند - پروفیسر عبد الحمید 1-4-0
وہ بھی دیکھا، یہ بھی دیکھئے! - اختر شیرانی -8-0
جرم و سزا - کمال احمد رضوی -6-0
شہید بے داد - مریم جمیل -4-
دھوکا - مریم جمیل -4-

لغت

نسیم اللغات اردو - نسیم امروہوی 4-0-0
کریم اللغات فارسی 1-0-
لغات فیروزی اردو ...
بحر عرب (عربی) - مرتبہ مولانا عبد...
ماڈرن اردو ڈکشنری ...
ماڈرن پرشین ڈکشنری ...
مفصل فہرست مف...

شیخ غلام علی اینڈ سنز ناشران و تاجران کتب کتاب منزل کشمیری بازار لاہور
بندر روڈ ...